JUNE
2023

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض لاہور

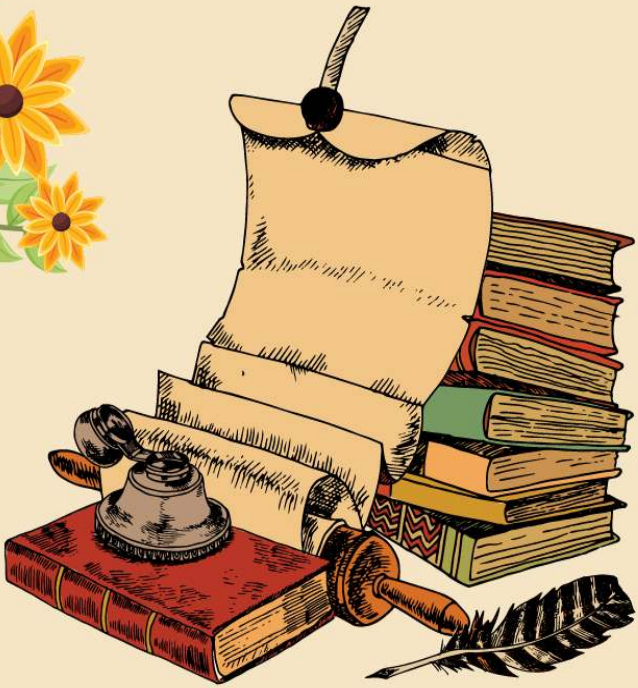

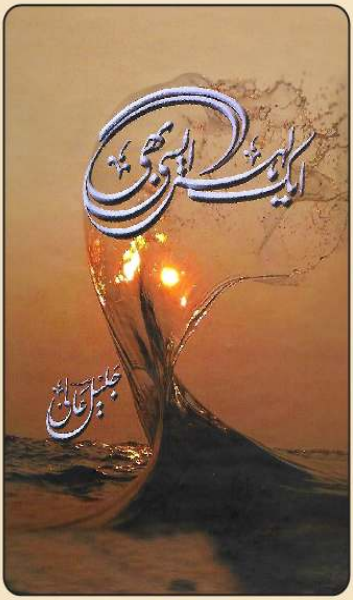

ایک لہر ایسی بھی
جلیل عالی

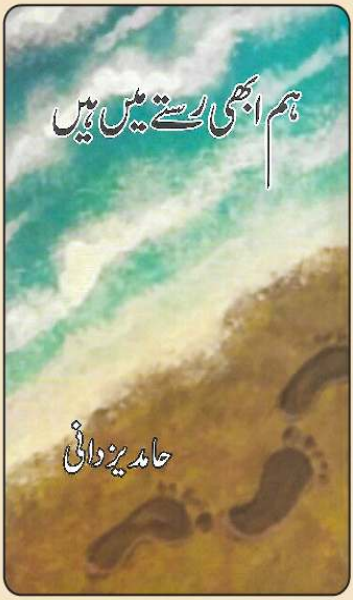

ہم ابھی رستے میں ہیں
حامد یزدانی

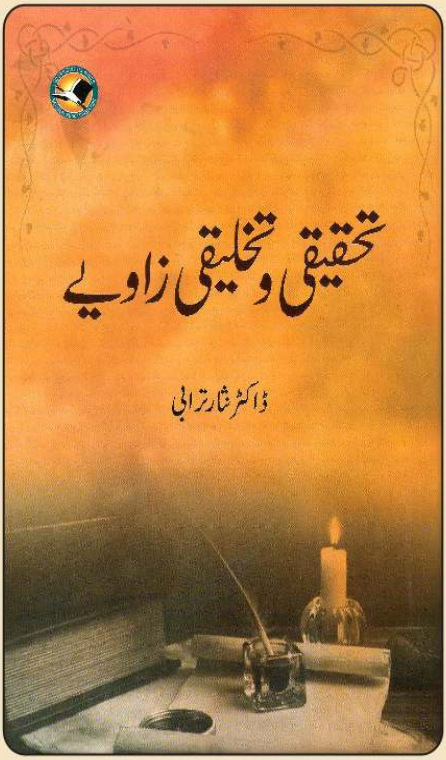

تحقیقی و تخلیقی زاویے
ڈاکٹر نثار ترابی

ایک دن مردے زندہ ہونا ہیں

دل یکا یک دھڑک کے بیٹھ رہے
اب بھی مَر مَر کدوں میں جلتے ہیں
طشتِ زَر کا پر لہُو کے چراغ

دل ہمیں بھی نہ غرق کر ڈالیں
کوئی فریاد سننے والا نہیں
ہمیں اَموات پار اُتاریں گی

ہم بد انجام بَدنہاد نہیں
ہم تو زندہ ہیں ایک دن کے لیے
آج ہی خلعتیں روانہ کرو
بھربھری ہڈیاں ، لہُو کے چراغ

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-6
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 31 - جون 2023 - شمارہ نمبر: 6

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاوید احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق:

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 92-42-37513000-3 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

www.trackntie.com
BAYAZ
ویب سائٹ برائے مطالعہ

عمران منظور نے جدید پرنٹرز اور پبلشرز سے ٹریک اینڈ ٹائی پلازہ 16 کلومیٹر نزد ٹھوکر نیاز بیگ سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	حسن عسکری کاظمی	7
2	نعت	محمد یٰسین قمر، خاور اعجاز، نسیم سحر، طالب انصاری، حامد یزدانی، اعجاز دانش، اکرم ناصر، نبیل احمد نبیل، سجاد حسین ساجد، حسنین مظہری	8 تا 17
3	عقیدت	ذکی طارق، مرزا آصف رسول	18 تا 19
4	رباعیات	محمد نصیر زندہ	20
5	مضامین	جلیل عالی، سلمیٰ اعوان، رفیع الدین راز، فرحت عباس شاہ، حامد یزدانی، فیصل زمان چشتی، نبیل احمد نبیل، علی رضا خان، شاہد اشرف، یونس خیال، راحیلہ خورشید، نعمان منظور	21 تا 77
6	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	78 تا 86
7	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر، راحت سرحدی، خاور اعجاز، محمد انیس انصاری، صفدر صدیق رضی، گلزار بخاری، اسلام عظمی، فرحت عباس شاہ، جمشید چشتی، منظور ثاقب، اقبال سروبہ، طالب انصاری، شہ طراز، سعد اللہ شاہ، حریم حیدر، خالدہ انور، شفیق احمد خان، شکیل اختر، اعجاز دانش، رخشندہ نوید	87 تا 177

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
7	غزلیں	شاہد ماکلی، ہمایوں پرویز شاہد، انصر حسن، شبیر ناز ش، اوصاف شیخ میتھو محسن، عقیل رحمانی، واصف سجاد، اویس الحسن، انیس احمد رضا اللہ حیدر، فرحت زاہد، سعدیہ بشیر، مسعود احمد، احمد جلیل اکرم ناصر، آفتاب خان، محمد اشرف کمال، علی رضا احمد افتخار شوکت، ارشد محمود ارشد، زبیر فاروق، عزیز عادل فیض رسول فیضان، ذکی طارق، محمود کیفی، ظہور چوہان، ارسلان ساحل عاطف جاوید عاطف، اکرم جاذب، مرزا سکندر بیگ، عمران اعوان نبیل احمد نبیل، وسیم جبران، عمر قیاز قائل، عقیل شانی، رمیض نقوی احمد محمود، صغیر احمد صغیر، محمد اشفاق بیگ، ازور شیرازی راجہ عبدالقیوم، بمیرا یوسف، طاہر یٰسین، علمدار حسین، مستحسن جامی فیصل زمان چشتی، کوکی گل، بشیر احمد حبیب، اصغر علی بلوچ، ملیحہ سیّد رانا غلام محی الدین، زاہد خان، مہر علی، اکمل حنیف، سید تیمور کاظمی عاصم بخاری، نائلہ راٹھور، فریدہ خانم، عابد معروف مغل، جیا قریشی زبیر خیالی، ثمر جمال، گل فراز، محمد علی ایاز، دانیال احمد زمان شہاب اللہ شہاب، عزیز قدیر مغل، رانا محمد شاہد	87 تا 177
8	افسانے	ابدال بیلا، حبیب الرحمٰن، عبدالرؤف کیانی، محمد افتخار شفیع وسیم جبران، حمزہ حسن شیخ، آفتاب محمود شمس، کومل شہزادی	178 تا 212
9	طنز و مزاح / خاکے	محمد ہمایوں، محمد کلیم، نور کمال شاہ	213 تا 224
10	نظمیں	خالد احمد، جلیل عالی، حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر محمد انیس انصاری، تابش کمال، فرخندہ شمیم، رخشندہ نوید احمد جلیل، شاہین عباس، سرور حسین نقشبندی، واحد سراج امجد بابر، نائلہ راٹھور، شبیر احمد آکاش، اعجاز رضوی	225 تا 241

حمد

یا رب کُھلی نہ ہم پہ حقیقت حیات کی
گُتھی کھلے گی کیسے حیات و ممات کی

تو ربِ کائنات ہے ایمان ہے مرا
پہچان میں نہ کر سکا خود اپنی ذات کی

حرفِ دعا ہے بارگہِ کردگار میں
اب تو کوئی سبیل ہو تکمیلِ ذات کی

اپنا یہی چلن ہو، ترا شکر ہو ادا
میں نے تو بات کی ہے فقط تیری بات کی

تیری عنایتوں کا تسلسل وہی رہا!
تخصیص کب رہی ہے یہاں دن یا رات کی

منظر تمام تیرے، مصوّر ہے تو کہ اب
یہ سب کرشمہ سازی رہی تیرے ہات کی

تو ربِ کائنات ہے، ہم جزوِ کائنات
تخلیق حرفِ کُن سے ہوئی کائنات کی

حسن عسکری کاظمی

نعتؐ

شوقِ ثنا متاعِ ہنر کر دیا گیا
کتنا رفیع ذوقِ نظر کر دیا گیا

مائل بہ نعت شام و سحر کر دیا گیا
میرا نصیب جذب اثر کر دیا گیا

بھیجا گیا بنا کے انھیں رحمتِ تمام
کیا سربلند بختِ بشر کر دیا گیا

بخشی گئی حضورؐ کی چاہت فقیر کو
اور اندمالِ زخمِ جگر کر دیا گیا

رکھ دی گئی خیال میں خاکِ درِ رسولؐ
فکر و شعور نور بسر کر دیا گیا

اک شہر جس کی چاہ دلوں کا سکون ہے
اک خاک جس کو کحلِ بصر کر دیا گیا

مہجور کو حضوری کی دولت عطا ہوئی
اک ذرّۂ حقیر قمر کر دیا گیا

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

سمتیں بدل گئیں ، رُخِ قبلہ بدل گیا
آئے نبیِ پاکؐ تو رستہ بدل گیا

متروک ہو چلے تھے نظامِ حیات سب
آپؐ آئے اور نصابِ زمانہ بدل گیا

آئی برائے فکر و عمل اِک نئی کتاب
پھر یُوں ہُوا کہ دہر کا بستہ بدل گیا

آباد پھر سے ہو گیا بازارِ زندگی
دم توڑتی حیات کا چہرہ بدل گیا

دُنیا نئے نظام سے منسوب ہو گئی
آپؐ آ گئے تو دہر کا نقشہ بدل گیا

شامل ہُوا کہانی میں بابِ سلامتی
اور داستان گوؤں کا قصہ بدل گیا

تبدیل ہو گیا سبھی سوچوں کا دائرہ
تعبیر اور خواب کا سانچہ بدل گیا

خاور اعجاز

نعتؐ

ہوئی جو عطائے حضورِؐ مکرم
تو لکھی ثنائے حضورِؐ مکرم

زمانہ اندھیروں میں گرنے لگا تھا
کہ تشریف لائے حضورِؐ مکرم

بھلا اِس سے بڑھ کر سَنَد اَور کیا ہو؟
خدا ہے وَرائے حضورِؐ مکرم

خدا سے محبت ، خدا کی محبت!
یہی ہے بِنائے حضورِؐ مکرم

عدو پر بھی دروازے جس کے کھُلے ہیں
محبت سرائے حضورِؐ مکرم

ملے گا یہ انعام بھی آخرت میں
سُنیں گے صدائے حضورِؐ مکرم

دِلوں میں رواں ہے، دواں ہے مسلسل
سدا سے وِلائے حضورِؐ مکرم

جو گزرے زمانے، جو ہیں آنے والے
سبھی ہیں برائے حضورِؐ مکرم

کرم ہو نسیمِ سحر پر بھی یا رب
عطا ہو رِدائے حضورِؐ مکرم

نسیمِ سحر

نعتؐ

ادنیٰ سا بھکاری ہوں میں دربارِ نبیؐ کا
سایا مجھے درکار ہے دیوارِ نبیؐ کا

حیدرؓ ہوں کہ حسنینؓ ہوں یا فاطمہؓ زہرا
ہر پھول بہت پیارا ہے گلزارِ نبیؐ کا

آتے ہیں ملائک بھی یہاں سر کو جھکائے
اونچا ہے بہت مرتبہ دربارِ نبیؐ کا

ہر عہد کو ہے شرعِ محمدؐ کی ضرورت
ہر دور طلب گار ہے انوارِ نبیؐ کا

خوابوں بھری آنکھیں مرے کس کام کی مولا
انعام عطا کر انہیں دیدارِ نبیؐ کا

بے کار نظریات نہیں چاہیں مجھ کو
طالب میں ثنا خوان ہوں افکارِ نبیؐ کا

طالب انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لکھتے ہی اُنؐ کا اِسم مبیںؐ جھلملا اُٹھیں
عرشِ ورق پہ کاہ کشانِ سخن تمام

نعتؐ

مرے بھی رات جیسے حرف و صوت کو سحر نشاں اُجالا دینے والی اُن کی ذات ہے
وہ جن کے پرتوِ جمال کی بس اک جھلک کا استعارہ جھلملاتی کائنات ہے

وہ جن کے خُلق نے در پئے رحمتوں کے وا کیے، ہے زندگی خراج جن کے واسطے
نظر میں اُن کی روشنی ہے، میری دھڑکنوں میں اُن کی یاد ہے، زباں پہ اُن کی بات ہے

وہ زخم جو اُحد میں آپ کو لگا، وہ میری رُوح میں کہیں ہے آج بھی کھلا ہوا
اُس ایک زخم کی مہکتی یاد سے، مری حیات، رشکِ گلستانِ شش جہات ہے

نبی کی ذات ہے رفیع بھی شفیع بھی، اُسی کے آسرے گزر رہی ہے زندگی
نبی کی نعت روح کی حیات ہے، نبی کی نعت ہی مرا وسیلۂ نجات ہے

اُتر رہے ہیں جن کے در کی حاضری کو صبح و شام، صف بہ صف ملائکہ کے قافلے
درود جن کے واسطے، سلام جن کے واسطے فلک سے آ رہے ہیں، اُن کی ذات ہے

حامد یزدانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تو نے ہر ذرّے کو سورج سے ہم آہنگ کیا
تو نے ہر قطرے میں اک بحر کی وسعت لکھی

نعتؐ

شہر نبیؐ کی خاک کا سرمہ ہے آنکھ میں
ہر وقت روشنی ہے اجالا ہے آنکھ میں

اندوہ و غم کی صبر کی دنیا ہے آنکھ میں
کرب و بلا کا ایسا حوالہ ہے آنکھ میں

از فرش تا بہ عرش نظر تک نہیں رہی
"عکس جمال گنبد خضریٰ ہے آنکھ میں"

جب جا رہے ہوں شہر مدینہ کو قافلے
سیل رواں کا آب مچلتا ہے آنکھ میں

دیکھوں جدھر حضورؐ کا جلوہ ہے سامنے
یوں حسن شاہ میں نے سنبھالا ہے آنکھ میں

کیف و سرور لا نہیں سکتا بیان میں
آنسو جب ان کے نام کا آتا ہے آنکھ میں

اے حسن دو جہاں مری نظروں سے دور ہو
میرے تو کوئی اور ہی بستا ہے آنکھ میں

وہ دل میں بس گئے مری آنکھوں میں بس گئے
ان کے بغیر کون سماتا ہے آنکھ میں

کوئی حسین آنکھ میں جچتا نہیں مرے
حب حضورؐ دل میں سراپا ہے آنکھ میں

ہجر و فراق میں جو تری یاد آ گئی
ساون کی طرح نور برستا ہے آنکھ میں

دانش خدا سے اور بھلا کیا کرے طلب
کعبہ ہے دل میں اور مدینہ ہے آنکھ میں

اعجاز دانش

نعتؐ

کوئی جب دل میں عشقِ مصطفیٰ کے بیج بوتا ہے
زمیں سے آسماں تک روشنی کا رقص ہوتا ہے

تری رحمت کو جوش آتا ہے پھر کھل کر برستی ہے
دعاؤں میں کوئی اشکوں کے جب موتی پروتا ہے

عبادت میں گنی جاتی ہیں اس کی نیند کی گھڑیاں
درودِ پاک جو پڑھتے ہوئے راتوں کو سوتا ہے

وہی خوش بخت ہے رکھتا ہے جو خواہش مدینہ کی
جو اس کے ہجر میں روتا ہے اور دامن بھگوتا ہے

وہاں جا کر یہاں کا کچھ بھی یاد آتا نہیں اکرم
ہوا ہے جس طرح تم سے وہاں ایسے ہی ہوتا ہے

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

قصد مدح کیے بیٹھا ہے پھر خالد احمد
شانِ خدا، خوشبو کے کنگن، ڈھالے گا لوہار

نعت

جب بھی شانِ شاہِ سرور دیکھنا اور سوچنا
اپنی آنکھیں، سر جُھکا کر دیکھنا اور سوچنا

جب عطا ہو اُس طرف سے باریابی کا شرف
کس طرح چمکا مقدر دیکھنا اور سوچنا

غور کرنا آپؐ کے لطف و کرم پر ہر گھڑی
رحمتیں اُنؐ کی برابر دیکھنا اور سوچنا

کیسے کُھلتے ہیں درِ رحمت برابر، آپؐ کی
یاد میں آنسو بہا کر دیکھنا اور سوچنا

آپؐ نے رکھے ہمیشہ دونوں پلڑے ایک سے
عدلِ آقاؐ میں وہ پتھر دیکھنا اور سوچنا

آپؐ محبوبِ خدا ہیں آپؐ ہیں ختم الرسل
رفعتِ شانِ پیغمبرؐ دیکھنا اور سوچنا

دے گیا ہے میری چشمِ بے بصر کو روشنی
وہ مرا محراب و منبر دیکھنا اور سوچنا

اُس گلی میں رُونما ہوتے ہیں کتنے معجزے
بوریا بستر لگا کر دیکھنا اور سوچنا

میں غلامِ مصطفےٰؐ ہوں اِس لیے مجھ کو نبیل
احتراماً سر جھکا کر دیکھنا اور سوچنا

نبیل احمد نبیل

نعتؐ

احسان ہے یہ مجھ پہ محمدؐ کی آلؑ کا
دیکھا نہیں حیات نے پرتو زوال کا

ملتے ہیں ان کے در سے مجھے علم و آگہی
پاتا ہوں ہر جواب میں دل کے سوال کا

خائف ہے مجھ سے میرا عدو اس لیے کہ میں
ہوتا نہیں شکار کہیں اس کے جال کا

جچتا نہیں ہے کوئی مری آنکھ میں کبھی
اس میں بسا ہے عکس ترے خدوخال کا

میں مبتلائے رنج ہوں مانگوں کرم کی بھیک
مجھ کو بھی ہو عطا کوئی لمحہ وصال کا

کب سے ہوں منتظر ترے در کی طلب لیے
اے کاش، مجھ پہ سہل ہو لمحہ محال کا

قابل کہاں تھا نعتِ محمدؐ کے میں حقیر
ساجدؔ کرم ہے مجھ پہ یہ زہرا کے لال کا

سجاد حسین ساجد

نعت

جب کبھی زندگی آزار رساں ہونے لگی
خود بخود نعت مرے لب پہ رواں ہونے لگی

کر دیا ان کی عنایات نے پھولوں سا لطیف
ساعتِ کرب جو سانسوں پہ گراں ہونے لگی

اُن کی سیرت کو کیا جب سے نگاہوں کا غلاف
مجھ پہ ہر منزلِ مستور عیاں ہونے لگی

دفعتاً سیدِ لولاک نے رخ موڑ دیا
جب مری سمت رواں بادِ خزاں ہونے لگی

ان کی نسبت کا اثر ہے کہ مری ہر مشکل
خود بخود میرے لیے راحتِ جاں ہونے لگی

سرِ معراج ہوئی پہلے بیاں حمدِ خدا
پھر بیاں مدحِ شہِ کون و مکاں ہونے لگی

مظہری شب کو جونہی نعت کی تکمیل ہوئی
نعت کے بعد تہجد کی اذاں ہونے لگی

حسنین مظہری

عقیدت

لفظوں میں کیسے پروؤں تری عظمت اللہ
کس طرح سے کروں آخر تری مدحت اللہ

اپنے محبوب کی امت میں کیا ہے پیدا
مجھ پہ یہ ہے تری سب سے بڑی رحمت اللہ

ہونی کر دینا زمانے کی ہر انہونی کو
صرف اور صرف یہ ہے آپ میں قدرت اللہ

زندگی اور اسے جینے کے تمام اسباب
تیری ہی تو ہیں عطا اور عنایت اللہ

کیا کرشمہ ہے ترا ایک مرض نے میرے
بخش دی ہے مرے دل کو تری الفت اللہ

باپ ماں بھائی بہن سے بھی نہیں ہو سکتی
اپنے بندوں سے جو تجھ کو ہے محبت اللہ

پھر رہا ہوتا ہر اک در پہ جھکاتا سر کو
جو نہ ملتا ترا در بہر عبادت اللہ

لے کے میں نام ترا کرتا ہوں جو کام شروع
اس میں کس درجہ سمو جاتی ہے برکت اللہ

ذکی طارق

عقیدت

خلف وسلف کے پیشوا صلِّ علیٰ محمدِ
شافعِ محشرِ جزا صلِّ علیٰ محمدِ

صلِّ علیٰ نبیّنا مژدہ سرا انہیں کے ہیں
جملہ رسل، سب انبیا صلِ علیٰ محمدِ

صلِّ علیٰ نبیّنا حسنِ ازل کے نور سے
عشق تمام مصطفیٰ صلِّ علیٰ محمدِ

ورنہ کہاں بچا کوئی وقت کے پھیر سے کبھی
اپنی اُنہی سے ہے بقا صلِّ علیٰ محمدِ

حُسن سے بھی حسین تر اسوۂ احسن البشر
سب کے لیے ہے رہنما صلِّ علیٰ محمدِ

حق تو ادا نہیں مگر کاش کہ ہو مری نظر
حبِ نبی میں خود رسا صلِّ علیٰ محمدِ

دشتِ جفائے عہد میں ڈھونڈ رہی ہیں ہجرتیں
پھر وہ مدینۂ وفا صلِّ علیٰ محمدِ

جادۂ و منزل و سفر کیسے ہوں گم؟ ہے راہبر
ان کے نجوم کی ضیا صلِّ علیٰ محمدِ

ہم کو عطا ہوا ہے دل، دل کو ملا نبی کا عشق
عشق نے جز جاں کیا صلِّ علیٰ محمدِ

خود میں نہ ہم وہ بھر سکے رنگ جو ہیں درود کے
حب و اخوت و ولا صلِّ علیٰ محمدِ

دل ہو کہ آصف! اپنا سر، سب ہیں فدائے رہ گزر
ہے جہاں ان کا نقشِ پا صلِّ علیٰ محمدِ

مرزا آصف رسول

رباعیات

آرائشِ امکانی کے پردے پڑے ہیں
آئینہ پہ حیرانی کے پردے پڑے ہیں
کھُلتا نہیں عشق سے تمنا کا حجاب
تصویر پہ عریانی کے پردے پڑے ہیں

.....

خورشید سوار اسم کے پار اُترا
افلاک شکن طلسم کے پار اُترا
طاؤس کے پیرہن تھے آواز کے رنگ
میں ایک دن اپنے جسم کے پار اُترا

.....

تلوار نہیں چلتی زباں کے آگے
چلتا نہیں زور آبِ رواں کے آگے
عورت کبھی جبر سے نہیں جھک سکتی
جھکتی ہے زمیں کب آسماں کے آگے

.....

چوٹی میں موتیا سجایا اُس نے
اُونچی ایڑی سے قد بڑھایا اُس نے
اک حشر سرِ بزم اُٹھانے کے لیے
زور ایڑی چوٹی کا لگایا اُس نے

.....

سر عظمتِ کردار سے ہوتا ہے بلند
سر جراتِ انکار سے ہوتا ہے بلند
یہ طرّہ و دستار کا محتاج نہیں
سردار کا سر دار سے ہوتا ہے بلند

لیلائی حیات کم پہن لیتی ہے
شوخی خوشبو کا رم پہن لیتی ہے
یہ عورت اک آبگینۂ مینائی
ٹوٹے تو نشاطِ غم پہن لیتی ہے

.....

ساقی لایا گیا ہوں مے خانے میں
یعنی ڈالا گیا ہوں پیمانے میں
میں گھومتا ہوں گردشِ پیمانہ سے
تسبیحِ روزگار کے دانے میں

.....

یہ شمس و قمر فریبِ آدم میں ہیں
سرگرمِ خرام زیبِ آدم میں ہیں
عالم ہے شرارِ ذرّۂ دشتِ جنوں
لاکھوں شرر ایسے جیبِ آدم میں ہیں

.....

خوشبو ہے کہ پھول کی قبا ڈھونڈتی ہے
میں وہ ہوں جسے روحِ خدا ڈھونڈتی ہے
رستے میری طرف سفر کرتے ہیں
منزل مرا نقشِ کفِ پا ڈھونڈتی ہے

محمد نصیر زندہ

رجائی احساس کا زندہ استعارہ (بحوالہ ''شیشے کے کنول'')

میرے ذاتی خیال میں ہم جس دَور سے گزر رہے ہیں وہ ایک طرح سے نظریاتی تصادم کا دَور ہے یا زیادہ صحیح لفظوں میں کم از کم پاکستان کی حد تک نظریاتی دَور بنا دیا گیا ہے۔ اِس نظریاتی مجادلے میں ہماری جنگ جویانہ جبلت ایک خطیب کی شکل میں ''ہم کسی سے کم نہیں'' کا نعرہ لگانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ خطابت کی حد تک یہ بات درست بلکہ بے حد ضروری ہے لیکن شاعرانہ ذات پر خطیبانہ ذات کے حاوی ہو جانے سے شاعر کی پوری شخصیت اور اُس کے خواب کبھی اُبھر کر سامنے نہیں آتے اور یوں اکثر اِس کا انجام ایک جذباتی اور فکری تشنج ہوتا ہے لیکن خاور اعجاز کے معاملے میں اِس لیے کا کوئی امکان نہیں، اُس کی شاعری اِس بات کی شاہد ہے کہ اُس نے نعرے کو اپنی شاعرانہ ذات پر غالب نہیں آنے دیا اور اِس سے کم از کم مجھے بہت طمانیت حاصل ہُوئی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مَیں نے اُس کی شاعری کے بارے میں کچھ کہنے کی خود پیشکش کی ہے۔

خاور اعجاز اپنی تخلیقی ذات کے حوالے سے نام نہاد نقادوں کی طرف سے ٹھونسے جانے والے اُن تمام مطالبوں کی مخالفت کرتا ہے جو شاعر کو لائن میں لگا کر اُس کی تخلیقی اپج کو فنا کے گھاٹ اُتارنے کا کام کرتے ہیں:

مجھ کو مِرے اشعار دلا دیجیے واپس
تنقید یہ لے جایئے اربابِ ادب تک

.....

جلیل عالی

لیکن خاور اعجاز کے لیے اشعار کے رُوٹھ جانے یا چھن جانے کا کوئی خطرہ نہیں کیونکہ:

وہ تخیل ہے میرے پاس کہ مَیں
لفظ مانگوں تو داستاں اُترے

.....

میر درد نے کہا تھا:

فرصتِ زندگی بہت کم ہے
مغتنم ہے یہ دید جو دَم ہے

.....

خاور اعجاز نے بھی زمین پر چلو پھر و اور دیکھو کے اِس روّیے کا اپنے عہد کے استعاروں میں اظہار کیا ہے:

تجھے مِلا ہے جو آنکھوں کا کینوس اے دل
تو پھر اِن آنکھوں میں قدرت کے شاہکار سمیٹ

.....

نصابِ زندگی کا بنیادی سبق یہی ہے جسے یاد رکھنے والے نہ صرف اپنی شخصیت کے امکانات کا حق ادا کرتے ہیں بلکہ زندگی میں فکر و عمل کے ایسے نشانات چھوڑ جاتے ہیں جو دُوسروں کے لیے دیر تک محسوس اور نامحسوس طور پر خیر و برکت کا ذریعہ بنے رہتے ہیں۔ تو مَیں کہہ رہا تھا کہ خاور اعجاز نے کسی نعرے کو اپنی شاعرانہ ذات پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ کسی قوم کی اِس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اُس کے تخلیقی ذہن بھی زندگی اور اُس کے مسائل کو ہمدردانہ اور متوازن نگاہِ بصیرت سے دیکھنے کے بجائے نعروں کے سیلاب میں بہہ جائیں۔ ایک سچا شاعر تو صداقت کی مکمل تصویر دیکھنا اور دِکھانا چاہتا ہے بلکہ اُس کی نگاہیں تو سرحدِ امکاں سے باہر تک بھی پہنچنا چاہتی ہیں۔ زندگی کسی سیدھے اور سپاٹ راستے کا نام نہیں ہے جس پر چلنے کے لیے تیر کا ایک ہی نشان کافی ہو اور انسان جب پوری بیداری کے ساتھ اِس سفر پر نکلتا ہے تو راستے کے پیچ و خم اور بھی نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں:

جس نے دیکھی ہی نہ ہو راہِ وفا کیا جانے
کس قدر موڑ ہیں اِس سیدھی سی پگڈنڈی پر

.....

جانے کس نے کہہ دیا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے کہ سادہ اور سہولت پسند طبیعتوں کو یہ بات بہت پسند آئی اور پھر کورس کی شکل میں صدیوں کے رٹے ہُوئے اسباق دہرائے جانے لگے لیکن ایک ہی جگہ پر پاؤں اوپر نیچے کرنے سے فاصلے کب طے ہوتے ہیں۔ ہر لمحہ بدلتی ہوئی زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے نگاہوں کا فوکس درست رکھنا بھی نہایت ضروری ہے اور نگاہوں کا فوکس اُس وقت تک درست نہیں ہو سکتا

جب تک فیصلہ کرنے کا حوصلہ نہ ہو کہ:
ہے حقیقت تو یہ منظر یہیں رُک جائے کہیں
ورنہ یہ وہم کسی گہرے کھنڈر تک جائے

.....

ایسے فیصلہ کن مرحلے سے گزر کر ہی یہ یقین حاصل ہو سکتا ہے کہ:
نئے زمانے کے غم بھی جدید طرز کے ہیں
غمِ حیات ! گزشتہ کے کاروبار سمیٹ

.....

پوری شخصیت کی تائید اور پشت پناہی کے بغیر کیے جانے والے فیصلوں سے خود کو دھوکے میں تو رکھا جا سکتا ہے لیکن اعتبارِ حیات حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے اِدھر اُدھر بھٹکنے اور اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہنے کا اصل سبب ہمارے ادھورے اور کچے فیصلے ہی تو ہوتے ہیں جو ہماری پوری شخصیت کی تائید میں طے نہیں ہو پاتے بلکہ دُوسروں کے منظورِ نظر بننے کی بے تابی کا نتیجہ ہوتے ہیں:
اِس شہر میں عبث ہے وفاؤں کی جستجو
یہ شہر تو بدلتا ہے رائے ہَوا کے ساتھ

.....

دِلوں کی کرچیاں اَب ڈھونڈنے سے کیا حاصل
کہا تھا کس نے کرو کاروبار شیشے کا

.....

ہمارے ادیب اور شاعر اپنی تخلیقی ذات کے اصلی اور حقیقی مطالبوں کو پسِ پشت ڈال کر بعض اندرونی اور بیرونی نظریاتی ایجنٹوں کے مصنوعی طور پر ٹھونسے ہُوئے فکری مطالبوں کو پورا کرنے میں لگے ہیں۔ یوں نہ تو ادب کے ساتھ انصاف ہو سکا اور نہ ہی نظریات کے ساتھ کیونکہ جعلی فکر و عمل سے کبھی ٹھوس نتیجہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے المیے نے جہاں اِس جعلی فضا پیدا کرنے والے ادبی سامریوں کا طلسم توڑا وہاں محبِ وطن ادیبوں اور شاعروں کو اپنے اور ملکی و قومی مسائل کے بارے میں ڈکٹیشن لینے کے بجائے خود سوچنے اور تجزیہ کرنے کا رجحان بھی دیا۔ اِس رجحان کا آغاز اِس بات کا یقین فراہم کرتا ہے کہ اَب پاکستان میں فکری اور نظریاتی جعلسازی کبھی نہیں پنپ سکے گی اور جس پاکستان کی تہذیبی آبیاری سچے اور ہمدرد فکر و احساس سے ہو گی وہ دُنیا میں ہمیشہ امن اور فلاحِ انسانیت کی زندہ و تابندہ روایات کا امین بن کر رہے گا۔ خاور اعجاز کی شاعری میرے اِسی رجائی احساس کا زندہ استعارہ ہے۔

☆☆☆☆☆

بلتستان کی قدیم نسوانی شاعری

1986ء کے آج جیسے ہی دنوں میں جب ہمالیہ اور قراقرم کے عظیم سلسلہ ہائے کوہ کے علاقے جو کل کے بلورستان اور آج کے بلتستان کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اِن دلکش وادیوں میں سفر کرتی اور یہ جان کر حیران ہوتی تھی کہ اِن پر ہیبت بلند و بالا پہاڑوں اور دشوار گزار راستوں کی وجہ سے جدید علم اور روشنی سے محرومی کے باوجود علاقے کے لوگ کتنے مہذب، پرامن اور فنکار ہیں۔ ان کے محلات اور قلعوں کے تعمیری انداز، موسیقی، شاعری اور معاشرتی آداب حیران کن تھے۔ یہ علاقہ تبت، لداخ، کشمیر اور ایران کے تہذیبی اثرات کا مرہون منت ہے۔ سب سے زیادہ تعجب خیز بات میرے لئے اُن قدیم بلتی عورتوں کی شاعری تھی جو میں نے اپنے اسفار کے دوران جناب غلام وزیر مہدی (مرحوم)، جناب عباس کاظمی اور بہت سے دیگر لوگوں سے سنی اور مختلف کتابوں سے پڑھی۔ یہ لوک شاعری اُن کے اپنے ماحول، اپنے جذبات، اپنے معاشرتی رویوں کے تحت ہوئی جو شاید شاعری کے مروجہ قاعدے کلیوں کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو۔ مگر ان میں اُس فطری سوچ، دکھ، احساس اور جمالیاتی لطافت کی جھلک ضرور نمایاں ہے۔ جو یہ بتاتی ہے کہ ذہانت اور فن خدا کی دین ہے اور اس کی یہ بانٹ ہر جگہ ہوتی ہے، صرف نارسائی درمیان میں حائل ہو کر اُسے محدود کر دیتی ہے۔ بہت بار جی چاہا تھا کہ اپنے ملک کے اِس دور افتادہ حصے کی اُن گمنام عورتوں سے اُردو ادب کے عام قاری کو روشناس کراؤں کہ وہ جانیں کہ تاریخ، فنون لطیفہ، اساطیری و لوک کہانیاں اور لوک شاعری کیسے کسی قوم اور کسی علاقے کی وسیبی پہچان بننے کا ذریعہ بنتی ہیں۔

سلمیٰ اعوان

تو لیجیے لداخ کے راجہ کی بیٹی کے جذبات سے
آگاہ ہوں کہ جسے بلتستان کا نامور حکمران علی
شیر خان انچن لداخ کو فتح کر کے بیاہ کر اپنے
ساتھ سکردو لایا۔ کچھ عرصہ بعد کسی تلخی پر کسی
ناراضگی پر بادشاہ نے لداخی ملکہ کو طلاق دے
دی۔ سکردو سے جاتے ہوئے اُس نے اپنے
جذبات کو جو زبان دی۔ وہ دیکھیے۔

سینکڑوں انسانوں اور گھوڑوں کے جلو میں
میری ڈولی سکردو میں اُتری تھی
اب واپس بھیج رہے ہیں
کوئی گھوڑا بھی نہیں اور کوئی بندہ بھی نہیں
تب میرے قدموں کے نیچے فیروزے کی سلیں بچھی تھیں
اور اب مجھے ننگے پاؤں بھیج رہے ہیں

بروشال کے علاقے کا ایک جنگی قیدی
کسی فتح کے نتیجے میں سکردو لایا گیا۔ اس
نے بلتی خاتون سے شادی کی۔ بہت
سالوں بعد کہیں اُسے اپنے آبائی جگہ
جانے کی ہڑک اُٹھی۔ اس نے اظہار کیا۔
بیوی نے اعتراض ہی نہیں کیا بلکہ اپنے
جذبات کو شعروں میں بھی ڈھالا۔

بروشال کے پہاڑی بیروں کے پھول تو ابھی کھلے نہیں
تم بروشال کیسے جاؤ گے؟
تمہارے سونے سے بھرے تھیلے کو میں کیا کروں گی؟
وہ میری راتوں کا ساتھی تو نہیں بن سکتا
تمہارے چاندی کے سکوں کا میں کیا کروں گی؟
وہ میرے دنوں کا ساتھی تو نہیں بن سکتا

وادی چھلو کی ایک خاتون کو کسی دوسری
وادی میں جا کر رہنا پڑا وہ اپنے محبوب
تراب نقپو کی یاد میں جو اظہار کرتی ہے۔
اِسے ملاحظہ کریں۔

مجھے گھر کی چھت سے ابھرتا سورج نظر آتا ہے
یہ سورج نہیں میرے تراب نقپو کا دمکتا بدن ہے
چٹانوں سے گزر کر آنے والے مارخور
تراب نقپو کی کوئی خبر ہو تو مجھے بتا
اگر تو اس کی کوئی خبر مجھے سنائے
تو تو ایک سے ہزار ہو جائے
اگر تو مجھے کوئی خبر نہ سنائے
تو تو شکاری کی نظروں میں آجائے

ایک دور افتادہ وادی کی ایک بہت
خوبصورت اور نیک عورت جس کا شوہر
دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگتا رہتا تھا۔
اس کا کوئی بچہ بھی نہ تھا۔ وہ ہر وقت غمگین اور
اُداس رہتی۔ اپنے دل کے درد کو شعروں کی
زبان دیتی۔ ذرا اُس کی فکر کی گہرائی دیکھیں:

جب پھول کھلتے ہیں تو نیچے سے اوپر کھلتے
چلے جاتے ہیں
جب پھول مرجھاتے ہیں تو اوپر سے نیچے

مرجھاتے چلے جاتے ہیں
ہر مرد کا شباب تین ادوار تک ہوتا ہے
ہر عورت کا شباب تین بچے جننے تک ہوتا ہے
خوبصورت پھول بھی تین صبح تک کھلتے ہیں
طاقتور گھوڑے بھی تین گیم کھیل سکتے ہیں
گھر بار نہ ہونے کا احساس شام کو ہوتا ہے
اولاد نہ ہونے کا احساس بڑھاپے میں ہوتا ہے

.....

کرگل اور کشمیر کے درمیانی علاقے کے ایک راجہ خاندان کی خاتون کی شادی کسی دور دراز علاقے میں ہوئی۔ اُسے اپنے میکے کی یاد آتی تو اپنے جذبات کا اظہار اپنی دوست سے کرتی۔
اے میری سہیلی میں پیدا تو کرگل میں ہوئی
لیکن زانسکر کا محل میرا مقدر کر دیا گیا
اونچا، بہت ہی اونچا، خوبصورت بہت ہی خوبصورت
میں اس بلندی اور خوبصورتی کا کیا کروں؟
جہاں سے مجھے کچھ نظر نہ آئے۔

.....

کہتے ہیں سرمیک کے ایک گاؤں کی ایک خوبصورت لڑکی کی ماں اس کے بچپن میں مر گئی۔ سوتیلی ماں اُس سے بہت برا سلوک کرتی تھی۔ لڑکی جوان ہوئی تو شادی کے پیغام آنے لگے۔ ماں رکاوٹیں کھڑی کرنے لگی۔ شادی نہ ہوئی۔ جوانی بڑھاپے میں ڈھلنے لگی تو اس نے اپنے جذبات کو اشعار کا رنگ دیا۔
میری سرخ ڈوروں والی آنکھیں
باپ کی اس گھٹیا بستی میں بے نور ہوتی جا رہی ہیں
میری یہ گھنی اور لمبی زلفیں جھڑتی جا رہی ہیں
میرے موتیوں کی لڑی جیسے دانت نیلے
ہوتے جا رہے ہیں
میرا سفید اور چیڑ کی طرح کا جسم گھلتا جا رہا ہے
میری جوانی کو رو لینے والی میری ماں
خدا تجھے عبرت ناک سزا دے

.....

بلتستان کے مقپون خاندان کا ایک راجہ اپنے ایک مصاحب کاظم سے ناراض ہو گیا۔ راجہ نے اُسے روندو کی جیل میں ڈال دیا۔ کاظم کی خوبصورت بیوی کو شوہر سے بہت محبت تھی۔ وہ شوہر سے ملنے روندو چل پڑی۔ طویل سفر میں اب جو گریاز اری شاعری کی صورت ہوئی۔ ذرا نمونہ دیکھیں۔
طویل راتیں، جدائی کی یہ طویل راتیں
میں پگلی اس رات کے تین حصے کرتی ہوں
رات کا پہلا حصہ تو پیدا کرنے والے کی عبادت کے لئے
دوسرا حصہ چودہ معصومین کی یاد میں وقف کرتی ہوں
تیسرے حصے میں کاظم شیر کے ساتھ بغل گیری میں گزارتی ہوں
پر صبح کو دیکھتی ہوں کہ یہ کاظم تو نہیں تھا

میرے گھٹنے تھے جو میرے سینے سے لگے ہوئے تھے

.....

شیلے سوک سکردو کی ایک دوشیزہ تھی جسے ایک نوجوان سے محبت ہوگئی۔ محبت کا راز فاش ہوگیا۔ والدین اور رشتہ داروں نے تادیبی کارروائی کرنے کا پروگرام بنایا۔ شیلے سوک کو خبر ہوگئی۔ اس کے اشعار ذرا دیکھئے۔

میں افواہیں سن رہی ہوں، میرے باپ
بھائی میری پٹائی کرنے والے ہیں
اے میری جان یہ لڑکی کسی مار پیٹ سے نہیں ڈرتی
اسے اگر ڈر ہے تو صرف تیری جدائی کا
اے میری جان تو جان لے
کہ میں تیری پٹائی سے قبل ہی
تجھے ساتھ لے کر برگے گھاٹی کے پار بھاگ جاؤں گی

.....

واضح رہے کہ برگے سکردو اور دیوسائی کے درمیان ایک گھاٹی ہے جسے برگے کہتے ہیں۔ دور افتادہ کسی وادی میں بیاہ کر آنے والی ایک لڑکی ایک طویل عرصے تک میکے نہ جاسکنے کے کرب کو کیسے لفظوں کا پیرہن پہناتی ہے۔ کیسے شوہر کو واسطے دیتی ہے۔

اے میرے عالی مرتبت راجہ
مجھے میرے میکے بھیج کہ میں اُداس ہوں
اگر آپ ایسا کریں گے
تو ہم مسلمانوں کی مسجد میں چراغ جلانے

جیسا عمل ہوگا

.....

مزے کی بات کہ وہ اس عمل کو کہیں بدھوں کی مذہبی رسم "مانے کی دیوار" بنانے سے جوڑتی ہے۔ کہیں وہ اُن ہواؤں، اُن کبوتروں اور اُن مسافروں کو خوش قسمت سمجھتی ہے۔ جو اس کے میکے کے محل کی کھڑکیوں سے ٹکراتے، جھروکوں پر اُترتے اور محل کے سامنے سے گزرتے ہیں۔ ایک بے حد خوبصورت اثر انگیز اور احساسات سے بھرا ہوا جذباتی اظہار یہ ہے۔

سترھویں صدی میں جب بلتستان کی حکومت کمزور ہوگئی تو افغان فوج نے علاقہ فتح کیا اور لڑکیاں، عورتوں کو لے جانے لگے تو ایک نوخیز لڑکی نے جو اظہار کیا اُسے ذرا دیکھیئے:

مجھے مت لے جاؤ
دیکھو تو مجھ پگلی کے لئے اِس ملک میں کوئی نہیں
کوئی نہیں جو مجھے لے جانے والے کا ہاتھ پکڑے
آپ کو میری قسم اگر میرے سُسر سے ملیں
اسے کہیں کہ اپنی بہو کے حصے کا کھانا بھی وہ خود کھالے
آپ کو میری قسم اگر میری ساس سے ملیں
اسے کہیں کہ اپنی بہو کے حصے کے کپڑے
بھی وہ خود پہن لے

☆☆☆☆☆

صحرائے ادب کا مجنوں - ریاض ندیم نیازی

ہم جہاں پلے بڑھے ہوتے ہیں وہاں کی تہذیبی فضا کا ہماری شخصیت پر اثر انداز ہونا ایک لازمی امر ہے۔ یہ فضا ہمیں بہت حد تک اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے۔ ہمارا کھانا پینا اور لباس تو کجا ہماری فکر و نظر پر بھی یہ فضا بڑا گہرا تاثر چھوڑتی ہے۔ گاؤں میں پروان چڑھنے والے کی شخصیت پر گاؤں کی تہذیب کا رنگ جتنا گہرا ہوتا ہے اتنا گہرا رنگ شہر میں پلنے والوں پر شہر کا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ بھی صاف ہے۔ گاؤں میں ایک جیسی مخصوص فضا پائی جاتی ہے جو صدیوں سے کم و بیش ایک جیسی ہے جب کہ شہر میں مختلف طرح کے لوگ بستے ہیں جس کی وجہ سے شہر کی فضا کا کوئی پکا رنگ بن نہیں پاتا۔ یہ تمہیدی چند سطریں بھی کسی وجہ سے تحریر ہوئی ہیں۔ ریاض ندیم نیازی اردو ادب کے عشق میں مبتلا رہنے والی شخصیت کا نام ہے۔ ویسے میں انھیں دشتِ ادب کا مجنوں بھی کہتا ہوں۔ جب انھوں نے اپنے آنے والے شعری مجموعے ''آئینوں کے شہر میں'' مجھے بھیجتے ہوئے کہا کہ میں اس پر کچھ لکھ دوں تو مجھے سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ یہ جس ماحول میں رہ رہے ہیں اس کا بہت ہی گہرا تعلق قبائلی زندگی سے ہے اور عموماً اس کا لہجہ بلند آہنگ ہوتا ہے۔ روزمرہ زندگی میں ہمیں یہ بلند آہنگی نظر آتی ہے۔ اردو غزل کو یہ بلند آہنگی پسند نہیں۔ اس سے اس کا جمالیاتی حُسن مجروح ہوتا ہے۔ ریاض ندیم نیازی کا مسودہ دیکھنے سے پہلے مجھے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں ان کی شاعری پر قبائلی لہجہ غالب نہ ہو لیکن مسودہ دیکھنے کے بعد میں اِک خوش گوار حیرت سے دوچار ہُوا۔ ندیم نیازی کے شاعر ہونے کی پہلی گواہی مجھے نہیں ملی۔ جس کے لیے یہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ فکری طور پر تو

رفیع الدین راز

کہیں کہیں اِن کے کلام پر قبائلی زندگی کا اثر ہے لیکن فنی طور پر انھوں نے اپنے آپ کو یوں کہیے اپنی شاعری کا خطابت سے بچا لیا ہے۔ اِن کا اِک شعر ہے:

تمام لوگ ہی میری انا کے دشمن ہیں
مگر ضمیر نہیں میری آگہی کے خلاف

.....

یہاں انھوں نے انا کو خودی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ یہ احساس انھیں قبائلی رہن سہن سے ملا ہے۔ وہاں اَنا کو خودی کے معنی ہی میں لیا جاتا ہے اور اس کی حفاظت کو باعثِ فخر سمجھا جاتا ہے جب کہ انا ایک منفی جذبہ ہے جو خودی سے سراسر مختلف ہے۔ اِک جگہ اور یہ کہتے ہیں:

ناز ہوتا ہے جنھیں اپنی اَنا پر وہ لوگ
شہہ کے دربار میں مطلوب نہیں ہوتے ہیں

.....

یہاں بھی اَنا خودی کے معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ معاشرے نے اَنا کا جو مطلب اِن کے احساس میں منتقل کیا وہ اِن کے اظہار کا حصہ بن گیا۔ معاشرے کے اور بھی بہت سے منفی رویے ہیں جنھیں ہم مثبت سمجھ کر اپنائے بیٹھے ہیں۔ ندیم نیازی نے اَنا کو خودی کے معنی میں لکھا تو ضرور ہے لیکن اظہار میں خطابت کا رنگ کہیں نہیں ہے۔ یہ ان کے اچھے شاعر ہونے کی مضبوط گواہی ہے۔ اسی فکر سے نسبت رکھنے والے کچھ اور اشعار دیکھیے جن سے یہ گواہی اور معتبر ہوتی ہے:

سر اُٹھاتا چودھری کے سامنے
گاؤں میں ایسا جواں کوئی نہ تھا

.....

ہم کو معلوم ہے انصاف نہ ہو گا لیکن
پھر بھی ہم تیری عدالت میں چلے آئے ہیں

.....

نہیں تھا چور کی آہٹ پہ بھونکنے کا چلن
یہ اور بات کہ کتا گلی گلی میں تھا

.....

ہزاروں ہی کفن یہ بیچ کھاتے ہیں غریبوں کے
جو اپنے تن پہ اوڑھے قیمتی پوشاک ہوتے ہیں

.....

اِن احتجاجی اشعار میں کہیں بھی نہ خطابت کا رنگ ہے نہ نعرے بازی اور نہ محتسابانہ طرز اظہار ایسے مضامین کے اظہار میں شاعری کی زبان کو برقرار رکھنا کسی جہاد سے کم نہیں اور اِس جہاد میں ندیم کامیاب نظر آتے ہیں۔ اِن کی فکر میں تنوع بھی آج کے بیش تر شعرا سے زیادہ ہے۔ تجربے اور مشاہدے میں شاعر اگر اپنے عہد سے جڑا ہوا نہ ہو تو اس کی شاعری کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ ندیم نیازی فکری طور پر اپنے عہد سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔

سانس لینے کی بھی فرصت نہیں لوگوں کو ندیم
زندگی اپنے مسائل میں گرفتار ہے آج
بن گئی اِک گاؤں یہ دنیا مگر
دور کب ہوں گے دلوں کے فاصلے

.....

جمالِ ذوق کو ڈس لے گا اُس کا پس منظر
حسین شہر کا بس دور سے نظارا کر

.....

نصیب ہی سے ملیں گے بچھڑ گئے ہیں جو
وہیں رہے گا جہاں جس کا آب و دانہ ہے

.....

اِن اشعار میں جن مسائل کا ذکر ہے وہ کم و بیش ہر شاعر کے یہاں ہمیں نظر آتے ہیں۔ میں نے اِن اشعار کو یہاں اِس لیے کوٹ کیا ہے کہ مجھے ندیم کا پیرائے اظہار قدرے مختلف دکھائی دیتا ہے ۔ یہ بہت اچھی علامت ہے۔

اِس مجموعے میں ایسے بیسیوں شعر ہیں جو ندیم کے اچھے شاعر ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔ ریاض ندیم نیازی کی شاعری میں ہمیں زندگی سے عبارت بہت سے خوب صورت رنگ جلوہ نمائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اِن میں حکمت و فلسفے کے رنگ بھی ہیں، عشقِ مجازی اور تصوف کی دل لبھانے والی چاندنی بھی۔ اِن اشعار کو دیکھیے اور ندیم کے مقام و مرتبے کا خود فیصلہ کیجیے۔

ڈھونڈتا کیسے میں اپنے آپ کو
میرے ہونے کا نشاں کوئی نہ تھا

.....

ملتی ہے ہر اِک گل کو فقط خاک سے خوش بُو
بارش نہیں لاتی کبھی افلاک سے خوش بُو

.....

آتے ہیں جس سے لاکھ زمانے وجود میں
اُس عرصۂ فراق کو اپنا بنا لیا

.....

ندیم آنسو بھری آنکھیں تھیں اُس کی
مگر بھیگا ہُوا دامن تھا میرا

جو سوچتا ہے تو ، وہ بھی اُسے سنائی دے
اُسے زباں سے نہیں دل سے بھی پکارا کر

.....

میں حادثات کی زد پر ہمیشہ رہتا ہوں
ہمیشہ مجھ کو تغیر نظر میں رکھتا ہے

.....

مرا دکھ شعر کی صورت اترتا ہے جو کاغذ پر
مٹا دیتا ہوں خود مجھ کو اگر اچھا نہیں لگتا

.....

ہر آتے جاتے کو جھک کر سلام کرتے تھے
پرانے لوگ محبت کو عام کرتے تھے

.....

میں کسی تشریح میں جائے بغیر صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ ان اشعار کو غور سے پڑھیے آپ نہ صرف ندیم کی شاعری بلکہ اُن کی شخصیت سے بھی واقف ہو جائیں گے کسی بھی شاعر کی شاعری اُس کی ذات کا آئینہ ہوتی ہے۔ جبھی شاعر کا شاعری کرتے ہوئے دنیا سے چھپنا ممکن نہیں۔ میں ریاض ندیم نیازی کو اُن کی تخلیق ''آئینوں کے شہر میں'' کی اشاعت پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

شفیق احمد خان کی طویل نظم (دروازۂ شب)

ادرا کی تنقیدی نقد ونظر

شفیق احمد خان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے کلیدی لکیر کھینچنا چاہیں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے رایگانی کے مدمقابل اپنی انا کو استوار کیا ہے اور اس تصادم سے پیدا ہونے والی گھٹن کو تخلیق کی قوت سے چیر کر شعر کے روزن بنائے ہیں جس سے نہ صرف خود زندگی کشید کی ہے بلکہ اپنے قاری کو بھی سانس لینے کے لیے تازہ ہوا کا وسیلہ عطا کیا ہے۔ اگرچہ بین الاقوامی ادب کے مطالعے میں شفیق احمد خان کا کوئی ثانی نہیں لیکن حیران کر دینے والی بات یہ ہے کہ اس کا مطالعہ مجید امجد یا ن۔م۔ راشد کی طرح کبھی بھی اس کے داخلی تجربے پر حاوی نہیں ہوسکا۔

اس کے اب تک غزل اور نظم کے آٹھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ایک مجموعہ طویل نظم ''رات ہنستی ہے'' بھی شائع ہو کر خاص وعام میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے اور نواں مجموعہ جو اس کی دوسری طویل نظم پر مشتمل ہے ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ میں یہ دعویٰ کرنے میں کسی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لے رہا کہ اس کا پینتیس سالہ شعری سفر میرے سامنے ہے اور اس سفر میں ہم دونوں سائے کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں۔

اگرچہ ہر انسان کسی نہ کسی درجے کی باطنیت کا حامل ہوتا ہے لیکن اس کی شدت، وسعت، گہرائی اور رفعت میں حسب توفیق فرق کو محسوس بھی کیا جاسکتا ہے اور اس کی پیمایش بھی کی جاسکتی ہے۔ تخلیق کار کا شمار ان خوش قسمت انسانوں میں ہوتا جو اپنی باطنی زندگی کا اظہار بلکہ جمالیاتی

فرحت عباس شاہ

اظہار کر پانے کی قابلیت اور طاقت سے بہرہ ور ہونے کی وجہ سے اظہار نہ کر پانے والوں سے مختلف اور ممتاز ہو جاتا ہے۔ لیکن اس خوش نصیبی کے پیچھے موجود کرب، اذیت، دکھ، ملال، اداسی، پچھتاووں اور رائیگانی یا محرومی کا ایسا مسلسل دہکتا الاؤ بھی موجود ہوتا ہے جس میں تخلیق کار ایک لمحے میں جل کر بھسم ہوتا ہے تو دوسرے میں اپنی ہی راکھ سے اٹھتا ہے اور خود کو نئے سرے سے تعمیر کر کے دوبارہ خود کو اسی الاؤ میں جھونک دیتا ہے۔ اگرچہ خارجی ادب کے تلذذ تک محدود فنکار درد و غم اور رنج و ملال کی تخلیقی شدتوں سے تو تقریباً بچے رہتے ہیں لیکن تخلیق کی اس لذت سے بھی محروم ہو جاتے ہیں جو موضوعیت کی خارجی تشکیل سے تخلیق کار کو حاصل ہوتی ہے۔

شفیق احمد خان نے جس خارجی یا مادی بے اعتنائی کا اظہار جگہ جگہ اپنے کلام میں کیا ہے اس کا ردعمل اس کے سماجی کردار اور تخلیقی اظہار میں بیک وقت نظر آتا ہے۔ اس کے ہاں شاعری اور سماجی کردار میں نہ کبھی کوئی بُعد سامنے آیا نہ تفریق۔ ویسے بھی یہ بُعد اکثر ہمیں خارجیت کے حامل شعرا میں ہی دیکھنے کو ملتا ہے کیونکہ شعر بنانے کے فن میں مہارت رکھنے والے شعرا کے ہاں نظریہء حیات کے بجائے فنی چابکدستی بنیادی مرکز ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی سماجی زندگی میں بھی چابکدستی کا ہی مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ احساس سے عاری لفظوں کو محنت سے سیدھا پدھرا کرے شاعری کی مصنوعی شکل دینے کا رویہ ہمیں غزل اور نظم دونوں میں نظر آتا۔ جبکہ شفیق خان کے ہاں بیرونی اور اندرونی مظاہر پر شاعرانہ اور تخلیقی ردعمل ایک مشترکہ احساساتی فعالیت کو جنم دیتا ہے جسے جذبات اور فکر کی سطح پر الگ کرنا ممکن نہیں رہتا۔ البتہ شفیق خان اس احساساتی فعالیت کو دو سطحوں پر بیان کیا ہے جن میں سے ایک انفرادی انسانی نظریاتی پکار کے طور پر سامنے آتی ہے اور دوسری سطح مادیت پرستی کے پتھرائے انسانوں کی بے حسی اور بے خبری کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

شفیق احمد خان کی زیرِ نظر نظم اگرچہ انسانی زوال اور سماجی شکست و ریخت کے ردعمل کے طور پر ایک گہری تلخی سے جنم لیتی ہے لیکن اس سے پہلے اتنی بھرپور شاعری تخلیق کرنے کے باوجود زیرِ نظر نظم میں شاید پہلی دفعہ شفیق احمد خان کی یہ تلخی اسے حقیقت مطلق اور حقیقی خوشی کے مآخذ، منبع اور محور کی طرف مراجعت پر قائل کرتی نظر آتی ہے۔

نظم کے آغاز میں ہی منزل مقصود پر پہنچنے کا واضح اعلان نظر آتا ہے جو اس سے پہلے صرف پنجابی صوفیا کی طویل فوک داستانوں کا خاصہ رہی ہے۔

مغرب کی مادہ پرستی کی لہر اور لادینیت کے

فیشن نے جہاں اہلِ مغرب کو شدید نفسیاتی بحران کا شکار کیا وہیں وہ سرمائے اور مادی سہولیات کی دوڑ میں لگ کے حقیقی خوشی بھی گنوا بیٹھے اور سرمایہ پرستی کے اس وائرس نے اہلِ مشرق کے اعتقاداتی نظام کو بھی ہدف بنایا جس کے نتیجے میں مشرقی معاشرے بھی ویسے ہی سماجی اور نفسیاتی بگاڑ کا شکار نظر آتے ہیں جیسے کہ مغربی ان سے پہلے ہوئے۔

شفیق احمد خان کی زیرِ نظر نظم نے انسانوں کو دو بڑے طبقوں کے درمیان خطِ تقسیم کھینچ کر انسانوں میں ہر طرح کی تفریق کو ذیلی یا ضمنی قرار دیا ہے۔ وہ انسانوں کو خالص اور ناخالص کلاسوں میں تقسیم کرتا ہے اور جب وہ دیکھتا ہے کہ مظاہرِ فطرت بھی کہیں کہیں خالص انسانوں کو ناخالص انسانوں کے معاشروں میں تنہا اور بے بس کرنے میں ناخالص انسانوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو جاتے ہیں تو اس کے لیے دعا جیسی آخری امید پر سے بھی اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ پوری نظم بے اعتنائی، رائیگانی اور بے بسی کے جبر تلے پس کے رہ جانے والے دل کی ایسی درد بھری کُوک اور ہُوک کے اظہار میں ڈھلی محسوس ہوتی ہے جس سے برآمد ہونے والے دکھ کی فریکوئینسی ہر صاحبِ دل اور حامل احساس فرد کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نظم انفرادی کرب سے اجتماعی دکھوں کے اظہار کی درد بھری سمفنی کا انداز لیے ہوئے ہے۔ دنیا بھر کے خالص انسانوں کا نوحہ بنتی یہ نظم عالمی ادب کے کسی بھی ایپک سے زیادہ پاور فل اور مؤثر ابلاغ کی حامل ہے۔ اس کو صنفِ نظم میں صرف اور صرف راقم کی نظم، ''اکیسویں صدی کی پہلی نظم'' کے ساتھ بریکٹ کیا جا سکتا ہے یا پھر فنونِ لطیفہ کے وسیع کینوس میں پیبلو پکاسو کی پینٹنگ گورنیکا کے ساتھ۔

شفیق احمد خان کی نظم اس بڑے کینوس کی پینٹنگ ہے جس پر ایک طرف تو برباد شہر کی لاش گمنام حسرتوں کی پکار پر ننگی ہے تو دوسری طرف انسانی بھیڑیے خون آلود دانت نکالے غراتے، جھپٹتے، مجبور اور بے بس آرزوئے حیات کو بھنبھوڑے دکھائے گئے ہیں۔ شاعر نے اس نظم میں اجتماعی آزردگی کے رنگوں میں خود اپنے احساس کو سب سے نمایاں خود کو پینٹ کیا ہے لیکن کمال یہ ہے کہ اس کی آزردگی ایک بے کراں قوت سے شہر کو کھنڈر میں بدلنے والے اقتدار پسند دولت پرستوں کے نقاب نوچ کر نہ صرف انہیں بھرے اور اجڑے ہوئے بازار میں ننگا کیا ہے بلکہ زخم خوردہ اور مرگ زدہ عوام کو جگانے کی سعی کرتے ہوئے شعور اور حوصلہ بخشا ہے۔ بالفاظِ دیگر شفیق احمد خان کی اس نظم کے بارے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناخالص انسانوں کی پیدا کی گئی اس تباہ کاری کی پینٹنگ ہے جس میں انسانی احساس کے مسلسل کچلے جانے والی فضا،

اسباب اور نتائج کو پینٹ کیا گیا ہے۔
شفیق احمد خان کی شاعری میں بالعموم اور اس نظم میں بالخصوص یہ وصف نظر آتا ہے کہ وہ کہیں بھی انسانی بگاڑ سے قلبی طور پر لاتعلق نظر نہیں آتا بلکہ انتہائی مغموم اور ملول رہتا ہے اور اسی سے نچوڑی ہوئی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کے ہاں داخل اور خارج کی دنیاؤں کے معاملات پر اظہار میں کہیں کوئی امتیاز یا فاصلہ موجود نہیں۔ میرے نزدیک بڑے تخلیق کار کی پہچان اور بڑے ادب کی پرکھ کے لیے اس سے شاندار کوئی پیمانہ نہیں کہ جس کے مدد سے ہم تخلیق کار کے باطن اور اس کی کارگاہ تخلیق تک رسائی حاصل کر سکیں۔ شاعر کو۔۔۔ دنیا سے آلام کے خاتمے کا اعلان کرتی صبح روشن کا انتظار کب اس کے محبوب کے انتظار کی تلوار پر لٹکا دینے کا اظہار یہ نظم کے دوران بھی اتنا غیر متوقع طور پر وقوع پذیر ہوتا ہے کہ قاری دنیا کے غموں اور ذات کے اندوہ کے درمیان ہلکورے لینے لگتا ہے۔ انفرادی کرب کے اظہار سے اجتماعی انتشار کے دکھ اور اجتماعی انتشار کے دکھ سے انفرادی کرب کے اظہار کی تشکیل شفیق خان کی شاعری میں اس طرح رل مل جاتی ہے کہ اس کی اکیلی انفرادی ذات پھیل کر عالمی سماج اور عالمی سماج سمٹ کر اس کی انفرادی ذات میں پھیلتے سمٹتے دکھائی دیتے ہیں۔
ایک اور بُعد جو زیرِ نظر نظم میں مُتا محسوس کیا جاسکتا ہے وہ ہے ماضی و حال کے زمانوں کی تفریق - شاعر صدیوں سے جاری تاریخی، سماجی اور انسانی زبوں حالی کے تناظر میں زمانہ حال کو اس سے چنداں مختلف نہیں پاتا تو اس کا ماضی بعید۔ ماضی قریب اور ماضی قریب حال بن کر زمانہ جاری موجود محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی مایوسی پھر بھی حتمی مایوسی کی شکل اختیار نہیں کرتی۔ شاعر افسردگی کی گہری فضا بناتی اس نظم میں انسانوں سے مایوس ہوتا ہے تو درختوں اور پرندوں سے طاقت حاصل کرتا ہے۔ وہ روشنی کی قید پر ملول ہوتا ہے لیکن اس کی فطری آزادی کے لوٹ آنے کی امید کو بھی زندہ رکھتا ہے۔ وہ المناکی کے دھوئیں میں بیٹھ کر بھی کلیوں اور پھولوں کے حسن اور خوشبو سے زندگی کشید کرنا نہیں بھولتا۔
زیرِ نظر نظم کا پھیلاو جہاں خارجی سطح پر انسانی تاریخ کا احاطہ کیے ہوئے ہے وہاں باطنی سطح پر بھی ایک ایسی زندگی کی کہانی ہے جس میں وقت کی پیمائش کے ٹولز خارجی دنیا کے بنائے ہوئے منٹ گھنٹے اور دن مہینوں سے مختلف ہیں۔ کیونکہ محسوساتی سطح پر انتظار، جدائی اور تنہائی کے کرب میں گزری ہوئی رات کے دورانیے کا تعین خوشی اور ہنگامے کی رات کے دورانیے کے برابر مقرر نہیں کیا جاسکتا - بظاہر مسلسل اور صدیوں پرانی اداسیوں کو پینٹ کرتی نظم ایک غیر محسوس ارتقائی سفر پر گامزن رہتی قاری کو دھیرے

دھیرے ایک المیہ سے نکالتی دوسرے سے محتاط کرتی اور تیسرے کو پچھاڑ دینے پر آمادہ کرتی آگے بڑھتے چلے جانے کے ساتھ ساتھ نئی صبح کی نوید، نئے شہر کی تعمیر، نئے لوگوں سے تفاعل اور نئے معاشرے کی تشکیل کی آرزو لیے ایک منظم تحرک کے ساتھ قاری کو مایوسیوں اور ناامیدیوں کی تاریکیوں سے نکال کر اندر سے تبدیل کرنے کے عمل سے گزارتی ہے۔ بہت کچھ جو بس سے باہر دکھائی دیتا تھا اس کے دسترس میں آنے کی خوشخبری سناتی طلب اور بے نیاز انسانوں کے کندھوں سے کندھا ملا کر فرد کی فتح سے اجتماع کے سدھار پر منتج ہوتی یہ نظم ادب عالیہ کے مرتبے پر اس لیے بھی فائز ہوتی ہے کہ بڑا ادیب صرف تلذذ کے سطحی نفسی دائرے میں قید نہیں ہوتا بلکہ بڑی فکر بڑے نظریے اور احساس ذمہ داری سے ہوتا ہے۔ ایک اور خوبی جو اس نظم کو ادب عالیہ میں لا کھڑا کرتی ہے یہ ہے کہ اردو کی بیشتر بڑی نظموں کے خارجی بیانیوں اور مصرعہ سازیوں کے برعکس اس میں کیفیات کے بنتے، معدوم ہوتے، سکڑتے کیفیاتی دائروں سے وضع ہوتی فضا اتنے طاقتور ابلاغ کی حامل ہے کہ بعض کینوز میں زبان و بیان اور فکر و خیال پر بھی حاوی ہو جاتی ہے۔ عمل تخلیق کا سب سے لطیف پہلو کیفیت ہے جو ہر تخلیق کار کو شدتوں کے مختلف تناسب سے ودیعت ہوتی ہے جس کے لیے احساس کی طویل ریاضت ناگزیر ہے۔ شفیق احمد خان زندگی میں کرب کی جن مسلسل بلاخیزیوں سے گزرا ہے ان کو تخلیقی اظہار کے تند و تیز سرچشموں کے کوئی اور طاقت متوازن نہیں رکھ سکتی۔ اس کا دکھ یک طرفہ نہیں بلکہ دوطرفہ بھی نہیں۔ وہ چاروں سمتوں سے منہ زور غموں میں گھرا ہوا شاعر ہے۔ کسی تماشائی کی طرح جبر کی چکی میں پستے انسانوں کے دکھ بیان کرنا اپنی جگہ لیکن خود کو ان کے درمیان بیٹھ کر اور ان میں اپنی ذات کو شامل کر کے محسوس کرنا ایک اگلا مقام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظم فرد اور معاشرے کا ایک ایسا نوحہ بن کر ظہور پذیر ہوتی ہے جہاں احساس، کیفیت، خیال اور نظریہ آفاقی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ ادرا کی تنقید اس احساس اور کیفیت تک رسائی کے لیے قطب نما کا کام کرتی ہے ورنہ تو بیشتر ناقدین لسانی داؤ پیچ اور نصابی بھول بھلیوں سے باہر ہی نہیں نکل پاتے۔ کیفیاتی ابلاغ میں کامیابی اس نظم کا ایسا تخلیقی کارنامہ ہے جو حقیقی اور مصنوعی ادب کے درمیان خط امتیاز کھینچنے کا پیمانہ وضع کرنا آسان بنا تا ہے۔ نظم کے چھیالیسویں کینٹو میں شفیق احمد خان نے نظریاتی اور اعتقاداتی ہر دو سطحوں پر علامہ اقبال کی صف میں کھڑا ہونے کا اعلان تو کیا ہے لیکن شفیق خان امت کی بیداری کے بجائے انسانی بیداری کا علم بلند کرتا ہے اور خودی کو مرکزہ ماننے کے

بجائے عشق کو ذریعۂ آگہی ماننے کا اعلان کرتا ہے۔ اس سے آگے کیٹوز میں شاعر عشق کے ادراک میں اقبال کی نسبت صوفی شعرا کے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔

مصرعے دیکھئے:

"کہ روز و شب کے حصاروں سے ماورا ہو کر
میں ایک عارفِ خود مست کی طرح ہر دم
جنوں کی لہر میں رہتا ہوں بے نیازِ جہاں
عجیب قہر میں رہتا ہوں بے نیازِ جہاں"

یہاں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ دنیا کی ابتری سے نجات کے وسیلے کے طور پر شاعر کا مدینے کی طرف دیکھنا اسی منزل کا سفر ہے جس کا واضح اشارہ نظم کے آغاز میں ہی کر دیا گیا ہے۔ ایک بظاہر غیر مذہبی اور دیوانہ لیکن مشاہدۂ باطن سے مشاہدہ خارج کا سفر طے کرنے والا شاعر معروض سے موضوع کے سفر پر روانگی کی ایک اور بامعنی اور فکر انگیز نشانی چھوڑتا ہے۔

نظم اپنے ارتقا میں انسانی نفس کی طہارت اور پاکیزگی کے سفر پہ آگے بڑھتی شاعر کی زندگی کے سماجی تخلیقی محرکات سے ہوتی ہوئی روحانی محرکات کے دائرے بناتی ہے۔ آلام کی بھٹی میں سلگ سلگ کے اور اضطراب کے بھنور میں تڑپ تڑپ کے نروان کی جستجو اور آرزو کا تانا بانا شاعر کو حقیقتِ مطلقہ سے مکالمے پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات کی نفی سے ایک قدم آگے بڑھ کر خود کو را کھ بنا تا محبوب میں خود کو ضم کرنے کے لیے مچلتا ہے اور یہ تڑپ، یہ اضطراب، یہ آرزو اپنی پوری احساساتی شدت کے ساتھ قاری کے دل تک منتقل ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شاعر نے نظم کے ابتدائی کیٹوز سے ہی کیفیت کے جس گداز اور احساس کی لطافت اور سوز سے جو فضا تشکیل دی ہے وہ نظم میں نمودار ہونے والے ہر منظر اور خیال کو ایک تسلسل کے ساتھ تسبیحِ شعر میں پروتی چلی جاتی ہے۔ عام طور پر نظموں میں موضوع کی وحدت صنف کے قائم شدہ معیارات پر پورا اترنے کا ثبوت دیتی ہے لیکن شفیق احمد خان کی زیرِ نظر نظم کیفیاتی اور احساساتی وحدت کے باعث جدید نظم کے صنفی اصولوں میں ایک اور اصول کا اضافہ کرتی ہے۔

شفیق احمد خان کی یہ نظم جہاں عالمی ادب کے عظیم فن پاروں کی صف میں پوری انفرادیت کے ساتھ اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوئی ہے وہاں اردو ادب میں ایک ایسے بڑے المیاتی تخلیقی پارے کا اضافہ کرتی جس کی مثال پہلے سے موجود نہیں اور انگریزی ادب میں بھی صرف تھامس ہارڈی کے ناول Tess of the d'Urbervilles اور شیکسپیئر کے ہملٹ کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔

☆☆☆☆☆

قائم نقوی : نئے آدمی کا نوحہ گر

اک آنکھ میں کتنے خواب کھلیں
اک درد میں کتنے درد گھلیں
اک لفظ میں کتنے لفظ ڈھلیں
تو شعر پہ روپ آجاتا ہے
(جیون ایک کہانی)

ایک فن کار کی آنکھ میں خواب کے ادھورے پن کا دکھ جب تعبیر کے درد کی صورت اختیار کرتا ہے تو خیال اظہار کے آئینے میں منعکس ہوجاتا ہے۔ لفظ میں لفظ جذب ہوتا ہے تو شعر کی صورت گری ہوتی ہے۔ خیال کو روپ بھی مل جاتا ہے اور اس کا روپ کھل بھی جاتا ہے۔ اردو شاعری کے عہدِ جدید کے جدید تر شاعر اور ہمارے خوب صورت اور باوقار و مہربان شاعر دوست جناب قائم نقوی کے یہ چار سادہ سے مصرعے پڑھتے ہوئے میرا ذہن کچھ ایسے ہی خیالات میں گھر گیا تھا اور تخلیقی عمل کا پیچیدہ اور پراسرار راستہ کسی قدر واضح دکھائی دینے لگا تھا۔ ایک سچے تخلیق کار کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اشیا اور تصورات کو مختلف یعنی اپنے ہی ڈھنگ سے دیکھتا ہے اور پھر اس کے اظہار کے لیے پیکر بھی اچھوتے اور نویکلے ہی بناتا ہے۔ تخلیق کی متنوع صورتوں میں سے شعر اظہار کا ایک انتہائی مشکل میڈیم ہے کہ اس میں پابندیاں بھی بہت ہیں اور اس کے لوازمات بھی ان گنت۔ شاعری سے انسان کے شغف اور محبت کا ثبوت یہ ہے کہ صدیوں سے ہم۔ قدم اس دوست کے وہ شاید نام ہی سے واقف ہے۔ اس سے کلی واقفیت کا دعویٰ انسان نے کبھی نہیں

حامد یزدانی

کیا۔ کرے بھی تو کیسے کہ یہ دوست اُس پر کبھی پوری طرح کُھلا ہی نہیں۔ ساتھ ساتھ رہا مگر ایک راز کی طرح، ایک پہیلی کی طرح۔ اور غالباً یہی امر ان کی دوستی میں کشش برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ہر آن رنگ بدلتا حُسن دیکھنے والے کی نگاہوں کو دعوتِ دیدار دیتا رہتا ہے اور اسے تشنگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تب سے اب تک شاعری اور شعر کی تفہیم و توضیح کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے اس کی تعریفیں وضع کی جارہی ہیں، دنیا کی ہر زبان میں۔

ہم عالمی ادب کی ورق گردانی کریں تو کیا کیا عمدہ تعریفیں مل جاتی ہیں شاعری کی مگر ہر تعریف بات شروع کرتی محسوس ہوتی ہے ختم کرتی نہیں۔ مثال کے طور پر پی۔ بی شیلی نے اپنے مضمون ''شاعری کا دفاع'' میں شاعروں کو دنیا کے غیر مسلمہ قانون ساز قرار دیا اور شاعری کو بیک وقت علم کے مرکز و طواف، تمام علوم کا جامع، دیگر تمام نظام ہائے فکر کی جڑ اور پھول سے تعبیر کیا۔ اس کے نزدیک شاعری ہی سے افکار کے شگوفے پھوٹتے ہیں اور اسی سے علم کی تزئین ہوتی ہے۔ خلیل جبران کے خیال میں شاعری خوشی، غم اور حیرت کا ایک مرکب ہے، بس چٹکی بھر الفاظ کے ساتھ۔ ایڈتھ سٹ ویل کے نزدیک شاعری حقیقت کی تعریف و توضیح ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سبھی تعریفیں اس عظیم فن کے کسی نہ کسی دل کش گوشے کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں اور یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ ماضی سے حال اور مغرب سے مشرق کی جانب رجوع کریں تو ہم اردو کے معتبر شاعر و ادیب اور مترجم و مدیر جناب محمد سلیم الرحمٰن کی اُس کی تعریف کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو اُن کے شعری مجموعہ ''نظمیں'' کے پیش لفظ میں مذکور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعری شعر کہنے والے کی ذات بیچ ایک دریا کا بہاؤ ہے جو اس کی ذات کو بانٹتا ہوا گزرتا ہے۔ کبھی سیرابی، کبھی طغیانی اور کبھی سکھاڑ (کا آئنہ دار) ایک ہمیشہ جگائے رکھنے والا بہاؤ، نہ بھرنے والا زخم، جدائی کا نشان۔ نظم بظاہر بے ترتیب حقیقی یا خیالی دنیا کو بار بار مرتب کرنے کی کوشش ہے۔ ہر نظم ایک پیام ہے جیسے کبوتر اُڑے اور مخالف ہواؤں اور صداؤں سے الجھتا ہوا جانے کس گھر پر جا اترے۔ یا بوتل میں بند عبارت جو سمندر میں بہتے بہتے کسی کے ہاتھ آجائے۔ ایک حیرت زدہ اجنبی کی کسی دوسرے حیرت زدہ اجنبی سے ہم کلامی۔

لطف یا ستم کی بات یہ ہے کہ یہ حیرت زدہ اجنبی ایک ہی دنیا میں، ایک ہی ماحول میں اور ایک ہی بستی میں رہتے ہیں مگر ایک

دوسرے سے ناآشنا ہیں جیسے گلیوں میں انسان نہیں سناٹا گھوم پھر رہا ہو۔ایک ان دیکھا سناٹا۔ قائم نقوی کے الفاظ میں:

سناٹا ہی سناٹا ہے گلیوں میں
یہ سناٹا کسے دکھائی دیتا ہے

.....

جدید شہر میں بسنے والے یہ جدید افراد نہیں جانتے کہ دراصل وہ ایک سی زندگی بسر کرتے ہیں، ایک سے مسائل کا شکار ہیں اور ایک سے خواب دیکھتے ہیں--- مگر پھر بھی ایک دوسرے سے انجان ہیں۔ایک دوسرے سے خائف ہیں۔

مگر ہم ہیں
کہ اپنے حال کی بے چہرگی میں
مصلحت آمیز خانوں میں بٹے
اک دوسرے سے خوف کھاتے ہیں۔
(تذبذب)

.....

دیکھا جائے تو یہی خوف آج کی بظاہر ترقی یافتہ دنیا کے جدید فرد کا المیہ ہے۔وہ آئنے میں خود کو دیکھ کر بھی نہیں پہچانتا ہے۔ زندگی کے آئنے میں ہر چہرہ اس کا اپنا چہرہ ہی تو ہوتا ہے۔بس نہیں پہچانتا وہ۔اپنی بے چہرگی کا احساس اسے ستانے لگتا ہے۔ کبھی وقت کی گرد آئنے کو دھندلا کر دیتی ہے اور کبھی حالات کی حدت چہرے کو مسخ کر دیتی ہے۔ صحیح صورت کوئی دیکھے بھی تو کیونکر--؟

یوں تو ن۔م۔راشد، میرا جی، اختر الایمان، فیض، ندیم اور مجید امجد گویا ہر بڑے جدید اردو نظم گو کا موضوع انسان ہی رہا۔راشد لابرابر انسان کی بات کریں یا حسن کوزہ گر کی، میرا جی انسان کی داخلی کیفیات اور ذاتی و نفسیاتی تجربات کو نظم کریں یا ندیم اپنے فنکار کو ریت کے بت بنانے پر متعجب کریں یا مجید امجد انسان کے ازلی و آفاقی دکھ کو اپنے شعری آہنگ میں سموئیں وہ سب درحقیقت تمدن کے آئنے میں انسان کی پہچان اور وقت کے تقاضوں کی میزان پر اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہی لگا رہے ہوتے ہیں۔ فرد کا ادھورا پن اور اس ادھورے پن سے نجوا ہوا دکھ کا یہی گہرا احساس ان تمام بڑے شعرا کے ہاں موجود ہے جس کا اظہار کہیں علامتوں میں ظہور پاتا ہے اور کہیں استعارات میں۔ مگر منیر نیازی کے ہاں جدید فرد کی تنہائی ایک اور قابلِ توجہ پہلو سے ہمکنار دکھائی دیتی ہے۔ بھرے پُرے شہر کی رونق میں شب و روز بسر کرنے والا فرد ایک عجب ذہنی تنہائی کا اسیر ہے اور وہ مسلسل زندگی اور موت کے سروں کو گاتھیں لگا تا محسوس ہوتا ہے۔ ہمارے باشعور شاعر قائم نقوی اس کیفیت کا ایک رخ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

اِس شب کی سیاہی میں، جگنو ہے کہ تارا ہے

پل بھر کو چمکتا ہے، رستہ تو دکھاتا ہے
امید بڑھاتا ہے
جینے کی تمنا میں
مرنے بھی نہیں دیتا
(یہ کیسی گھڑی آئی)

.....

ایک کامیاب تخلیق کار اپنے انفرادی دکھ کو اجتماعی، عارضی رنج کو دائمی اور ایک معمولی غم کو آفاقی بنا کر پیش کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ اسی لیے اس کا ہم عصر ہی نہیں بلکہ آنے والے دور کا قاری بھی اس کا مخاطب و ہم مکالمہ ٹھہرتا ہے۔ وہ زمانے کے لیے نہیں بلکہ زمانوں کے لیے لکھتا ہے۔ وہ زندگی کے ایک رُخ پر نہیں بلکہ ہر ہر گوشے پر قلم اٹھاتا ہے۔ وہ سڑک پر کام کرتے مزدوروں ہی دکھ بیان نہیں کرتا بلکہ دفتروں کے مقفل میں عزتِ نفس اور آزادیٔ اظہار کی قربانی کی بھی عکاسی کرتا ہے:

ہمارا قتل ہوا دفتروں کے کرمل میں
ہم اپنے نقش فقط فائلوں میں چھوڑ آئے

.....

تخلیق کار کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ موجود کی ان دیواروں میں بھی ہمہ وقت امکان کے در بناتا رہتا ہے تاکہ آنے والے زمانوں کی ہوا سے اس کا اظہار تر و تازگی پاتا رہے اور اس کے افکار کی روشنی آنے والے شب و روز تک راہ پا سکے۔ وہ بیک وقت کئی زمانوں سے منسلک ہوتا ہے۔ کئی دنیاؤں کی سیر کر رہا ہوتا ہے۔ ازل ابد کی تمازتوں کو چکھتا ہے۔ آفاق و افلاک کی پہنائیوں کی شناوری کرتا ہے۔ زمین کی حدود کو عبور کر کے خلا کی وسعتوں سے ہم کلام ہوتا ہے۔ قائم نقوی اس تجربے کو اپنے تخلیقی افق پر یوں اجاگر کرتے ہیں:

ہم اپنے ہونے کی اور نہ ہونے کی جستجو میں
ازل ابد کی تمازتوں میں
ردائے افلاک تن پہ اوڑھے ہوئے
خلا میں بھٹک رہے ہیں
(خواہش اور کوشش کا برزخ)

ہماری خاک کے ذرے نہ چھانو
خلاؤں سے اب اپنے رابطے ہیں

.....

ہم دیکھتے ہیں کہ جدید زندگی نے جہاں انسان کو بظاہر کئی مادی سہولیات سے متعارف کروایا ہے اور ترقی کی نت نئی راہوں سے آشنا کیا ہے وہاں اس نے اجتماعی زندگی کے تصور کو کمزور کر کے انفرادی زندگی، ذاتی ترقی اور معاشی حصول کی دوڑ میں شامل کر دیا ہے۔ ایک نا مختتم دوڑ جس کا نشانِ منزل نامعلوم ہے۔ سبھی اس دوڑ میں شامل ہیں۔ ایک ہی سمت دوڑ رہے ہیں۔۔۔ مگر ایک دوسرے کی

جانب دیکھنے کی فرصت نہیں۔
روز و شب کے جال میں یہ کون دیکھے
کون ہے کس حال میں یہ کون دیکھے

.....

ایک دوسرے کے اندر کیا اپنے اندر جھانکنے کی بھی مہلت نہیں۔ ایسے ہی جدید فرد کے نوحہ گر ہیں ہمارے عہد کے محبوب اور خوب صورت شاعری قائم نقوی جن کی شاعری اسی احساسِ زیاں کی آئینہ دار ہے کہ آدمی کو آدمی کا احساس نہیں۔ وہ اپنی ہی خواہشوں کے گھیرے میں مقید ہو کر رہ گیا ہے:
اپنی ہی خواہشوں میں ہر آدمی گھرا ہے

.....

مگر ہر کوئی اپنی اپنی جگہ تنہا ہے اور خاموش ہے۔ وہ اظہار کا راستہ نہیں پا رہا۔ جانے کس خوف سے۔ مگر قائم نقوی خاموش نہیں رہ سکتے۔ وہ سوال کرتے ہیں:
کیوں ہر زباں پہ چپ کا تالا لگا ہوا ہے؟

.....

پھر وہ ایک ایک کا چہرہ دیکھتے ہیں اور انھیں اندازہ ہوتا ہے کہ حالات کے پسے ہوئے یہ سب افراد تو پوری شدت سے چیخ رہے ہیں مگر ان کی آواز کسی کو سنائی نہیں دے رہی۔ اندر کی اس آواز کی رسائی تو ایک شاعر کی حساس سماعت تک ہی ہو سکتی ہے۔ بس وہ سن سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ:
اِس شہرِ بے اماں میں ہر شخص چیختا ہے

.....

یہ شہرِ بے اماں جس میں مادی آسائشوں کی ریل پیل ہے جذبات سے عاری ہے۔ ظاہری چکا چوند کی کشش دور دیہات اور قصبات کے باسیوں کی نیند اُچاٹ کر کے رکھ دیتی ہے اور وہ اس شہرِ بے اماں کو منزلِ سکوں سمجھ کر اس کا رُخ کرتے ہیں۔ ہاں کچھ ایسے بھی سادہ لوح ہوتے ہیں جو اپنی بنیادی ضروریات کے حصول کے لیے اور اپنے پیاروں کی آسائش کے لیے یہ دردناک سفر اختیار کرتے ہیں:
بچھڑ رہے ہیں لحہ لحہ بیٹے کتنی ماؤں سے
شہروں شہروں بکنے والے مزدوری کے ناؤں سے

.....

نقل مکانی کا یہ سفر پھر عمر بھر ختم نہیں ہوتا۔ دائرہ در دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ مگر افسوس جب یہ سفر ختم ہوتا ہے تو مسافر پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وہ تو دائرے کی نقطۂ آغاز ہی پر کھڑا ہے۔ وہیں پر جہاں سے وہ چلا تھا۔ تو سفر کون کر رہا تھا؟ یہ سفر حقیقت تھا یا محض سراب؟ اب اس کے پاس یہ سوچنے کے سوائے کوئی راستہ بھی تو نہیں۔ معاشی آسودگی کے حصول کے لیے وہ کیسے کیسے ان مول رشتے اور عزیز تعلقات کو دُور چھوڑ آیا تھا۔ ماں کے آنچل کا

دمکتا آسمان، دعاؤں کے سبھی سائبان، سبھی
کچھ قربان کر کے ملا کیا سوائے اذیت،
تنہائی اور تلخ یادوں کے؟ ہمارے قائم نقوی
اس دکھ کو جا بجا بیان کرتے ہیں اور بڑے
موثر انداز میں بیان کرتے ہیں:

اک مکاں کی خواہش میں لامکاں چھوڑ آئے
دربدر بھٹکنے کو آسمان چھوڑ آئے

منزل پالینے کی اندھی خواہش میں
اک مدت سے ہم نے اپنا گھر نہیں دیکھا

شہروں میں اک عمر گزاری پھر بھی تنہا تنہا ہیں
آج وہ یاد آتے ہیں لمحے جب نکلے تھے گاؤں سے

سورج ڈوبا، شام کی سرخی حدِ افق پر ٹھیر گئی
اور تھکن کی زہری ناگن آ کر لپٹی پاؤں سے

صبح ہوتے ہی تنہا ہوئے بھیڑ میں
ہر قدم کی ہزیمت اذیت بنی
(اک جیسا موسم)

قائم نقوی شہر میں بسنے والے جدید فرد کی بات کرتے ہوئے اس کے احساسِ زیاں کے ساتھ ساتھ اس احساسِ تنہائی اور احساسِ بیگانگی کی نشان دہی بھی کرتے ہیں جو انسان کے سامنے اپنے تشخص سے محروم ہو جانے کا دکھ بن کر ابھرتی ہے۔ قائم اس نئے آدمی کے احساسات، جذبات، مشاہدات اور تجربات کو اپنی شاعری میں خاص جگہ دیتے ہیں۔ عدم شناخت کے اس رنج کا ذکر وہ اس انداز میں کرتے ہیں:

ہمیں تو اپنے ہونے کی گواہی ڈھونڈنی ہوگی
کسی در پر کوئی تختی بھی اپنے نام کی باقی نہیں اب تو
ہوا کے ہاتھ میں اپنا تشخص ہے
کہ ہم حرفوں کی سچائی کے منکر ہوتے جاتے ہیں
ہمارے رابطے اور سلسلے سب ایک جیسے ہیں
(ہوا سرگوشیاں کرتی ہے)

.....

شہر کے گھروں میں آسائشیں مل جاتی ہیں۔ کچھ مادی سہولتیں بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ سفر کے نت نئے وسائل اور سماجی روابط کے جدید ذرائع تک رسائی مل جاتی ہے مگر ساتھ ملتے ہیں تحائف بے خوابی کے، کمروں میں مقید تنہائی کے، تعلقات میں در آنے والے حبس کے کیونکہ اس جدید فرد نے محبت کے دالان کی سمت کھلنے والی کھڑکیاں تو بند کر رکھی ہیں۔ تازہ ہوا کا جھونکا آئے تو آئے کہاں سے؟ قائم فرماتے ہیں:

ٹوٹتے خواب کی کرچیاں رہ گئیں
آنکھ میں کتنی بے خوابیاں رہ گئیں

.....

بند کمرے سے کوئی بلاتا رہا
چیختی فون کی گھنٹیاں رہ گئیں

حبس بڑھتے ہی احساس ہونے لگا
بند کمرے کی کچھ کھڑکیاں رہ گئیں

.....

سارے چہرے مرے شناسا ہیں
گو مجھے کوئی جانتا ہی نہیں

.....

قائم نقوی کی شاعری کے تجزیہ کار گواہی دیتے ہیں کہ ان کے ہاں جدید معاشرہ میں بیگانگی، مغائرت، منافقت اور مسافرت کے تصورات کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور انسان کی روزمرہ زندگی پر ان کے اثرات کی عکاسی بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی یہی خصوصیت انہیں عصری صداقتوں کا امین شاعر قرار دیتی ہے۔

محمد سلیم الرحمٰن نے بھی قائم نقوی کی نظموں کا جائزہ لیتے ہوئے بجا طور پر محسوس کیا کہ شاعر اپنے ہونے، نہ ہونے کی گواہی کا متلاشی ہے۔ عدم تشخص کا احساس اسے بے چین کر دیتا ہے۔ انفرادی دائرہ، اجتماعی دائرہ۔ ذہنی کرب، اضطراب کے پس منظر میں مصلحت اور منافقت جیسے رویوں سے نفرت کی رو بہہ رہی ہے۔ وہ کھلی فضا میں آنا چاہتا ہے، ان سے نجات پا کر، گھٹن سے نکلنا چاہتا ہے۔ اعصابی تناؤ سے چھٹکارا چاہتا ہے۔ وہ طلوعِ آفتاب کا منتظر ہے، نیم تاریکی میں۔

وہ وحشت اور دہشت کے جنگل سے نکلنا چاہتا ہے ورنہ اسے ڈر ہے کہ اصل آدمی کہیں اس کے اندر پڑا پڑا ہی نہ مر جائے:

یہاں دن رات - اک پرہول وحشت
اور دہشت
سرسراتی ہے ڈراتی ہے
یوں لگتا ہے کہ ہم جنگل کے باسی ہیں
کسی صحرا میں رہتے ہیں
(کسی ان دیکھے سورج کے منتظر)

اندر کا آدمی کبھی باہر نہ آ سکا
پتھرا گیا وہ جسم کے اندر پڑے پڑے

.....

پھر وہی احساسِ مسافرت، احساسِ مفارقت اور احساسِ منافقت کلیدی احساسات کے طور پر ہمارے سامنے ابھرتے ہیں۔ عہدِ نو کی حشر سامانیوں اور محرومیوں کے پُرآشوب مگر خیال انگیز فکری اور اسلوبی سانچوں میں ڈھلی دل پذیر شاعری ہم سے ہم۔ کلام ہوتی ہے جو ان کی فکری اساس کی کاملیت کی شاہد ہے۔ وہ روایت اور جدت سے یکساں محبت کرتے ہیں۔

تمام افراد جو تیرے اطراف گھومتے ہیں
شناخت اپنی کھو رہے ہیں
میں آشناؤں میں اجنبی بن کے جی رہا ہوں
(اے رب کعبہ)

قائم نقوی مزاجاً سادگی پسند شاعر ہیں۔ وہ انتہائی سادگی اور سلاست سے گہرے جذبات اور تلخ حقائق مصرعہ مصرعہ قاری تک منتقل کرتے ہیں۔ صداقت، عصری ادارک، باطنی آگہی، سچے جذبے، یہ سب ان کی شاعری کے خمیر میں شامل ہیں جو ان کی تخلیقات کو دوام بخشنے کا وسیلہ بنتے ہیں اور پھر ان کے شعری بطن میں ایک بے غرض صوفی اور درویش بھی تو چھپا ہوا ہے جو ان سے دل میں اتر جانے والی کافیاں لکھواتا ہے جن میں وہ دنیا کے کٹھور پن کے گلہ مند دکھائی دیتا ہے۔

بند کروں میں آ پہنچا ہے بازاروں کا خوف
دنیا ہوئی کٹھور رے ساجن
دنیا ہوئی کٹھور

(کافی)

قائم نقوی کے شعری مجموعوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم پر آشکار ہوتا ہے کہ وہ عصری شعور کے حوالے سے سماجی عدم مساوات کے فروغ کے ذمے دار افراد اور مخصوص استحصالی طبقے کی سرزنش بھی کرتے ہیں اور ایک پرامن معاشرہ کی تشکیل کے خواب کی بھی چہرہ نمائی کرتے ہیں۔ اپنی تشویش یا اظہار کرتے ہوئے اور نکتہ چینی کرتے ہوئے بھی وہ اپنے مخصوص دھیمے لہجے کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ہاں احتجاج تو ہے مگر نعرہ بازی نہیں۔ اور یہ حرفِ احتجاج بھی بڑی تخلیقی شان کے ساتھ ظہور پزیر ہوتا ہے۔

پیاس کی فصلیں اگا لو لب بہ لب
شہرِ جاں اب کربلا ہو جائے گا

ہمارے دکھ بھی اک اندھے۔ بھکاری کی طرح ہیں
راہ چلتے ٹھوکریں کھاتے۔ کسی کے پاؤں پڑتے ہیں
تو یوں اک دن گزرتا ہے
یونہی وہم و گماں میں رات کٹتی ہے۔ کہاں سورج نکلتا ہے
مقدر کب بدلتا ہے۔

(مقدر کب بدلتا ہے)

قائم نقوی کی شاعری ایک ایسے فرد کی داستان سناتی ہے جو سراپا دھول دھول ہے، اس کا بدن وقت اور حالات کی کٹھنائیوں کے مقابل تھکن سے چور چور ہے مگر وہ ہار ماننے کو تیار نہیں ہے۔ وہ باعزم ہے۔ وہ ان دکھوں کا کا مداوہ جانتا ہے۔ وہ شکست و انتشار کے عہد میں ایک ٹوٹے ہوئے فرد کی تصویر ضرور ہے مگر اس کے پس منظر میں اداسی یا ناامیدی کی تاریکی نہیں بلکہ خیر و فلاح کی دائم روشنی پرافشاں ہے۔ آسماں پر اڑتے پھرتے بادل اسے نئے موسموں کی آمد کی خبر سناتے ہیں:

آسماں کی سمت اڑتے بادلوں کے درمیاں
آنے والے موسموں کا راستہ تکتا رہوں

.....

سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ رجائیت، یہ امید، یہ مثبت و توانا سوچ جو شاعر کے لہجے کی انفرادیت ہے وہ آخر آتی کہاں سے ہے؟ تو اس سوال کا جواب بھی قائم نقوی ہمیں اپنی شاعری میں فراہم کر دیتے ہیں۔ ہم صاف محسوس کرتے ہیں کہ وہ عدل و انصاف کی کمی، انسان کی ابتری اور مستقبل کے اندیشوں اور انسانی مسائل کو محض بیان کر دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ ''ویسٹ لینڈ'' کے خالق ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی طرح ان مسائل کے موثر حل کی جانب بھی بلیغ اشارہ کر دیتے ہیں۔ ایلیٹ بھی انسانی مسائل کا حل روحانیات اور دین کی طرف رُخ کرنے میں مضمر پاتا ہے اور ہمارے قائم نقوی بھی۔ یہاں ان کے ہاں سفر اور مسافرت کے استعارے ظاہری اور بدنی سے اوپر اٹھ کر داخلی اور روحانی بالیدگی کے دل کش حصار میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک پیغمبرِ اسلام اور ان کی آلؑ کا فکری اور عملی تتبع ہی ہماری مشکلات کا واحد حل ہے۔ دینِ اسلام ہی اصل روحانیت کا منبع ہے اور یہی انسانی مسائل کے حل کا ضامن ہے۔ آقاؐ اور ان کی آلِؑ پاک سے قلبی لگاؤ اور روحانی قربت ہی وہ آبِ حیات ہے جو وقت کے کربلا میں ہماری پیاس بجھا سکتا ہے۔

ترا ذکر، فکر کی تازگی، یہی فکر، دیں کی اساس ہے
تری ذات سے ہے جو آشنا، وہی شخص عشق شناس ہے
مجھے دین و دنیا کی فکر کیا، ترے نقشِ پا پہ ہوں میں رواں
جسے آستانہ ترا ملے اسے کیا خوف و ہراس ہے

.....

نبیؐ کا گھر ستارے، پھول، خوشبو
یہ مینارے ہدایت کے نشاں ہیں
انہی کے دم سے نورِ آدمیت
انہ کے دم سے روشن دوجہاں ہیں

.....

قائم نقوی کی شاعری کے تدریجی ارتقا پر نگاہ کرتے ہوئے دیانت دار نقاد یہ کہے بغیر نہ رہ سکے گا کہ قائم ایک مکمل شاعر ہیں جو روایت اور جدت کے امتزاجی حُسن کو دھیان میں رکھتے ہوئے اور عصری فنی تقاضوں کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے نئی فکر کی حامل دل پزیر شاعری کرنے پر قادر رہے اور اردو شاعری کے دل دادگان کو اپنے نرم اور خوب صورت لہجے میں انہی کی زندگیوں سے آشنا کرتے رہے۔ ان کی شخصیت کے وقار اور اخلاص کے رنگ ان کے اشعار میں بھی جھلکتے ہیں اور ان رنگوں کا عکس مستقبل کی تخلیقی دیوار پر بھی نمایاں ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

☆☆☆☆☆

خالد احمد، مہربان شخصیت اور باکمال شاعر

ہم نے اس سال بھی جی بھر کے نہ دیکھا تجھ کو
خالد اس سال بھی ہم نے وہی نادانی کی

.....

ایک شاعر ایک دانشور ایک ڈرامہ نگار ایک کالم نگار اور سب سے بڑھ کر ایک محبت کرنے والی روح، جس نے تمام عمر لکھنے پڑھنے میں گزار دی، جس نے شعر و ادب کو اپنے سر کا تاج بنایا، جس کے شاگرد اس کو استاد مانتے ہوئے اور بتاتے ہوئے فخر محسوس کرتے، جس کے مصرعوں کی تراش خراش اس کی علمی و ادبی پرواز کا پتہ دیتی ہو، جو جمالیاتی قرینوں سے مکمل آگاہ ہو اور خوبصورت اور دل میں اُتر جانے والے اشعار کہنے کا قرینہ جانتا ہو ایک سچا اور کھرا درویش منش انسان جسے سب لوگ خالد احمد کہتے ہیں۔

خالد احمد ایک مکمل شاعر تھے ان کی شخصیت کے ہر پہلو سے علم و ادب کی شعاعیں نکلتی تھیں۔ لاہور کا ادبی منظر نامہ کبھی بھی ان کی شخصیت کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا ایک وقت تھا جب لاہور کی کوئی ادبی تقریب ان کی موجودگی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔ وہ زندہ دل اور بزلہ سنج طبیعت کے حامل تھے خوش گفتاری ان کی شخصیت کا خاصہ تھی وہ فقرہ بازی میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے جیسی بھی صورت حال ہو اپنے فقرے جملے کو ضائع نہیں ہونے دیتے تھے ان کے اشعار کی طرح ان کی باتوں میں بھی تازگی، شگفتگی اور بے ساختگی جھلکتی نظر آتی تھی انھوں نے اپنی تخلیقی استعداد کی بنیاد پر ادبی دنیا میں اپنا نام بنایا اور سکہ جمایا وہ پاک ٹی ہاؤس اور الحمرا ادبی بیٹھک کی جان اور شان تھے۔ شعر و ادب کو ان پر ناز تھا اور وہ شعر ادب کی جان تھے۔ اپنے بارے میں وہ خود ہی کہتے ہیں کہ:

فیصل زمان چشتی

رنگ کہتے ہیں کہانی میری
کس کی خوشبو تھی جوانی میری
ناقدوں نے مجھے پرکھا خالد
خاک صحراؤں نے چھانی میری

.....

خالد احمد ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل اور سب سے پیار کرنے والے تھے۔ وہ آج بھی اپنے مداحین کے دلوں میں دھڑکتے ہیں۔ ان کے انداز ان کے مزاج اور درویشی جھلکتی نظر آتی تھی ان کی ذات میں دانشوری اپنی تمام تر خوبیوں اور رعنائیوں کے ساتھ موجود تھی۔ انھوں نے کبھی اپنے جونیئرز اور نوجوان لکھنے والوں کو یہ محسوس ہی ہونے دیا تھا کہ وہ ایک نابغہ روزگار ہستی کے ساتھ موجود ہیں۔ یہی بات ان کی ذات کو بلندی پر لے جاتی ہے۔ وہ محبت کرنے والی شخصیت تھے اور محبتیں بانٹتے تھے۔ جو ایک دفعہ ان سے مل لیتا وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا اسی لیے آج تک لوگ اُن کو یاد کرتے ہیں اور ان کی محبت کی ان کی اپنائیت کی مثالیں دیتے ہیں خالد احمد ایسے شاعر ہیں، جن کی بات دل میں اُترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے وہ وسیع المطالعہ تھے اور قدیم و جدید علوم سے ان کی شناسائی تھی جس سے اُن کی علمی و ادبی بصیرت مزید نکھر کر سامنے آئی۔ انھوں نے اپنے منفرد لہجے کی بدولت اپنا وجود تسلیم کروایا۔ انھوں نے تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا اس قدر خوبصورتی سے استعمال کیا ہے کہ اشعار سن کر فکری بصیرت بھی پیدا ہوتی ہے اور شعور کی ترسیل کا کام بھی ہوتا ہے:

دل اگر کلیسا ہے، غم شبیہِ عیسیٰ ہے
پھول راہبہ بن کر، روح نے بکھیرے ہیں

ایک اور شعر دیکھیے:

تری رُتوں نے ہمیں چاندنی سمیٹنے کو
ہوا سے ہاتھ دیے بادلوں سے جال بُنے

.....

ان کے اشعار کا مفہوم بہت واضح ہوتا ہے ابلاغ کا مسئلہ بالکل نہیں ہوتا وہ اپنی فکری حساسیت سے اپنے اردگرد کے لوگوں اور پورے معاشرے کو متاثر کرتے نظر آتے ہیں انھوں نے معاشرے کی فکری اور شعوری آبیاری کی ہے۔ سماج کو وہ اپنی شاعری کا اہم حصہ قرار دیتے ہیں اور اس میں ہونے والی تبدیلیاں ان پر براہِ راست اثرانداز ہوتی ہیں۔ معاشرے سے لگاؤ اور جڑت ان کو معقول شاعر بناتی ہے وہ ایک حساس شخصیت تھے جو اپنے اردگرد ہونے والی توڑ پھوڑ سے قطعاً لاتعلق نہیں تھے بلکہ لوگوں کے دکھ سکھ میں اپنا دل دھڑکتا محسوس کرتے تھے:

وقت کے ساتھ تقاضوں کو بدل جانا تھا
تجھ کو اے صبحِ ستم! شام کو ڈھل جانا تھا

.....

ہر شخص حقائق کی کڑی دھوپ کے ڈر سے
تانے ہوئے اوہام کی چادر نظر آیا

ایک اور شعر میں بھی ان کے جذبات دیکھیے:

کس کی تعلیم کا ، آخری سال تھا
چوڑیاں بک گئیں بالیاں رہ گئیں

.....

خالد احمد انسانی رویوں اور اقدار کی پامالی پر بھی ملال کا شکار تھے اور اپنے دوستوں سے اور اکثر نجی محفلوں میں اس کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسان کو اس دنیا میں محبت تقسیم کرنے اور نفرتیں ختم کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے:

وہی بھائی ، وہی بھاؤ ، وہی قدریں خالد
کیا توقع کوئی لے کر سرِ بازار آئے

.....

بام و فلک اُجاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں
میرے پر اس نے جھاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں
دشتِ سخن اُجڑ گیا ، قیس کا بن اُجڑ گیا
میرے خط اس نے پھاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں

.....

ان کے اپنے رنگ ہیں اپنی خوشبو ہے جس میں رچ بس کر شعر اتنا تر و تازہ اور خوش نما ہو جاتا ہے کہ بے اختیار دل سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں ان کی شاعری کا رنگ و آہنگ جدید ہے، جس کی وجہ سے وہ خوبصورتی پیدا ہوتی ہے جو قاری کو اپنے حصار میں جکڑ لیتی ہے۔ خالد احمد اپنی اعلیٰ و ارفع فکری و فنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر آسمانِ ادب کے ایسے درخشندہ ستارے بن کر اُبھرے جو اپنی تخلیقات کی تجلیات بدولت دائم جگمگاتے رہیں گے۔

خالد احمد کے خیالات کی رنگا رنگی و خوبصورتی اور موزوں ترین الفاظ کے انتخاب نے ان کی شاعری کو مزید نکھارا یہ ان کی شاعری کا اعجاز ہے کہ وہ اپنے عہد کے ہی نہیں بلکہ ہر دور کے شاعر ہیں کیونکہ ان کی شاعری کے موضوعات آفاقی اور لافانی ہیں ان کی نظر اپنے عہد کا مستقبل کے زاویوں کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے ان کی علمی بصیرت کی وجہ سے سماج کا کوئی بھی پہلو اور رویہ ان کے قلم کی دسترس سے باہر نہیں جا سکا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خاص و عام کے مقبول شاعر تھے:

خالد احمد کے شعری مجموعوں میں 'تشہیر'، 'ایک مٹھی ہوا'، 'ہتھیلیوں پہ چراغ'، 'پہلی صدا پرندے کی'، 'دراز پلکوں کے سائے سائے' اور 'نم گرفتہ' شامل ہیں جبکہ نثری مجموعوں میں 'لمحہ لمحہ' اور 'بین السطور' شامل ہیں۔ انھوں نے پاکستان ٹیلی وژن کے لیے بے شمار نغمات تخلیق کیے۔ پی ٹی وی کے لیے متعدد ڈرامے بھی لکھے جنھیں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ جن میں خرمن، پانی، غبار، کاجل گھر اور قاسمی کہانی ان کے یادگار ڈرامے ہیں وہ اردو پنجابی اور انگریزی کے علاوہ ہندی سنسکرت، فارسی اور عربی زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے اور ان زبانوں کے الفاظ بھی اپنی شاعری میں استعمال کرتے تھے وہ توانا اور مکمل شاعر تھے ان کی تخلیقی قوت قابل رشک تھی۔ غزل نظم اور خاص طور پر پابند نظم میں وہ کمال کی مہارت رکھتے تھے۔ وہ فنِ موسیقی پر بھی عبور رکھتے تھے اور

رموزِ موسیقی سے اچھی طرح واقف تھے۔ تیس برس تک لکشمی چوک میں الفضل ہوٹل پر رات گئے تک قیام کرتے تھے اور وہیں پر اپنے دوستوں اور شاگردوں سے ملاقات کرتے وہ نوجوان شعرا کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرتے بلکہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی دل سے قدر بھی کرتے تھے۔ ان کی لازوال علمی و ادبی خدمات پر انھیں صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔ حمد و نعت اور مذہبی شاعری خالد احمد کا ایک اور مضبوط حوالہ ہے جو ان کی شاعرانہ عظمت کو بلند بھی کرتا ہے اور ایک منفرد طرز احساس بھی دلاتا ہے۔ انھوں نے حمد نعت اور سلام و منقبت بڑے ذوق و شوق سے لکھی ان کی فکر اور احساس مذہبی روایات سے جڑا ہوا تھا۔ ان کے ہر شعر میں حُبِ رسولؐ اور محبت اہل بیت نمایاں نظر آتی ہے جس کا ثبوت انھوں نے اپنی پہلی کتاب، تشبیب جو نعتیہ قصائد پر مشتمل تھی کو چھپوا کر دیا:

تو نے ہر شخص کی تقدیر میں عزت لکھی
آخری خطبے کی صورت میں وصیت لکھی
خالد احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی

.....

قرآن مجید کے مطالعے، احادیث کے مضامین، نبیؐ کریم سے محبت اور اہل بیت کے مودت کے موضوعات پورے چاند کی چاندنی کی طرح ان کی شاعری میں جگمگاتے ہیں، جن کی ضوفشانی سے ایسے ایسے اشعار تخلیق ہوئے، جس سے قاری کا دل و دماغ منور، معطر اور پاکیزہ ہو جاتا ہے:

ابھی مٹی نہ برسی تھی ابھی پانی نہ برسا تھا
مگر بزم عناصر میں ترے ہونے کا چرچا تھا

ایک اور خوبصورت شعر دیکھیے:

رحمتِ حق پہ بن کے جب آپؐ گواہ آ گئے
ہم بھی گلے میں ڈال کر فردِ سیاہ آ گئے

.....

خالد احمد مکمل تہذیب یافتہ اور مشرقی روایات کے حامل، بردبار اور شفیق اور ملنسار شخصیت کے مالک تھے وہ دوستوں کے دوست تھے۔ خدمت اور محبت کے جذبات سے سرشار اور لبریز تھے۔ جو بھی ان کے قریب تھے سب ان کے گنج شفقت سے فیضیاب ہوتے تھے ان کے مزاج میں وہ شائستگی لطافت اور متانت تھی جو بزرگوں کی شان ہوتی ہے وہ اپنے افکار و اشعار کی صورت ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ آخر میں ان کے کچھ اشعار دیکھیے:

دھوپ کی ریت کی تنہائی کی ویرانی کی
ہم نے اک عمر ترے غم کی نگہبانی کی

ہم پجاری بھی ہیں خالد فقط آزر تو نہیں
بُت تراشتے ہیں خدا مانا ہے خود پوجے ہیں

دوستوں کی بھیڑ میں خالد کہاں یاد آئے گا
ذہن سے ترے بھی اک دن محو ہو جاؤں گا میں

☆☆☆☆☆

لیوٹولسٹوئی کے ناول ''اینا کیرینینا'' کا تجزیاتی مطالعہ

نبیل احمد نبیل

ایک اور جگہ ایک ناول کے ایک معمولی کردار کی گفتگو کی وساطت سے وہ اپنے معاشرے کی آزاد خیالی کو جو اس کے خیال میں موزوں نہیں ہے - اس طرح ہدفِ تنقید بناتا ہے-

''پہلے یہ ہوتا تھا کہ آزاد خیال وہ شخص ہوتا تھا جو مذہب، قانون، اخلاق کے نظریوں میں تربیت پاتا تھا اور خود جدوجہد اور کدوکاوش کر کے آزاد خیالی تک پہنچتا تھا، لیکن اب ایک نئی قسم نمودار ہونے لگی ہے جو اپنے آپ پنپنے والے آزاد خیالوں کی ہے جو اُگ آتے ہیں، بڑے ہو جاتے ہیں، لیکن انھوں نے کبھی یہ سُنا تک نہیں ہوتا کہ قوانین تھے، اخلاق تھے کہ مسلم الثبوت اساتذہ تھے- یہاں لوگ براہِ راست ہر چیز سے انکار کر دینے کے نظریے میں پروان چڑھتے ہیں یعنی وحشی ہوتے ہیں-'' (۱۴)

ناول میں جو کہانی بیان کی گئی ہے، اس کا زمانہ فروری ۱۸۷۲ سے لے کر جولائی ۱۸۷۶ تک کے تقریباً ساڑھے چار برسوں پر محیط ہے- اس زمانے کے منظرنامے میں ماسکو، پیٹرزبرگ کے ساتھ کچھ چھوٹے شہر اور دیہات کا ذکر بھی موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹولسٹوئی نے اپنے عہد کی دیہی اور شہری زندگی کے مابین تقابل کچھ

اس طرح کیا ہے کہ جس سے اس کے اپنے نظریات نمایاں ہوتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت Henry Gifford نے اس طرح کی ہے:

"The ideal of the family is honoured by the Shcherbatskys and by Levin whose old home represents for him a whole world, the world that had been the life and death of his parents. It is the world of Mascow tradition, rather than of Petersburg novelty, and these two cities are here, as elsewhere in Russian Literature, used to symbolize the conflict between old pieties and modern pressures. (15).

(ترجمہ:- Scherbatskys اور لیون (Levin) خاندان کی مثالیت کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیون (Levin) جس کا پرانا گھر اس کے لیے ایک مکمل دنیا ہے جہاں اس کے والدین نے اپنی موت وحیات کا سفر طے کیا۔ یہ ماسکو کی روایتی دنیا ہے نہ کہ پیٹرز برگ کی جدت طرازی، اور یہ دونوں شہر یہاں قدیم اقدار و جدید دباؤ کے تصادم کی علامت کے طور پر پائے جاتے ہیں، جیسا کہ روسی ادب میں اکثر مقامات پر یہی علامت نگاری دیکھنے کو ملتی ہے۔)

ٹولسٹوئی کو ناول نگاری کے فن پر دسترس حاصل ہے اور وہ بے مقصد طوالت میں کہیں بھی جاتا ہوا نظر نہیں آتا۔ پورے ناول میں کوئی واقعہ فاضل نظر نہیں آتا بلکہ کہانی کی بُنت کا لازمی جُز معلوم ہوتا ہے۔ وہ ہر واقعہ کی جزئیات کو بڑی تفصیل سے بیان کرتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس واقعہ کے رونما ہونے کے وقت وہ خود وہاں موجود تھا اور وہ جو کچھ لکھ رہا ہے وہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے مثلاً گھوڑوں کی ریس کا منظر اس نے بڑی باریک اور نفیس تفصیلات کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے ٹولسٹوئی کے گہرے مشاہدے کا پتا چلتا ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس مشاہدے کو لفظوں میں بیان کرنے پر اسے کیسی بے مثال مہارت حاصل ہے۔ گھوڑوں کی اس ریس کو اس نے علامتی معنویت میں استعمال کیا ہے کہ اس میں پورے ناول کی روح سما گئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی جگہ جگہ علامتوں کا بڑا خوب صورت استعمال کیا گیا ہے۔ خاص طور سے وہ خواب جو ناول میں بیان کیے

گئے ہیں۔ وہ بھی علامتی معنویت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں مثلاً اینا بار بار ایک خواب دیکھتی ہے کہ نچلے طبقے کا ''ایک گندا سا شخص جھک کر ہتھوڑی سے لوہے کی کسی چیز پر وار کر رہا ہے۔''(۱۶) اس خواب کی معنویت کو Vladimir Nobokov نے بہت سراہا ہے۔ ''آنا کے خواب میں وہ گندا سا شخص جو کچھ لوہے کے ساتھ کر رہا ہے، یہ وہی ہے جو'' آنا کی گناہ آلود زندگی نے اس کی روح کے ساتھ کیا ہے اور اسے برباد کر دیا ہے۔''(۱۷)

ٹالسٹائی نے تشبیہات کا بھی بڑا خوب صورت استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر آنا کارینینا کی زبان سے ٹولسٹوئی نے جس تشبیہ کی وساطت سے اس کی داخلی کیفیت کو بیان کروایا ہے۔ اس سے بہتر انداز ممکن نہیں تھا۔

''میں ساز کے حد سے زیادہ تنے ہوئے تار کی طرح ہوں جو ٹوٹ کر رہے گا۔''(۱۸)

آخر میں ناول کی تکنیک کے حوالے سے اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ اگرچہ اینا کیرینینا اور لیون کے اردگرد پھیلے ہوئے واقعات کے حوالے سے ناول کا پلاٹ دو حصوں میں منقسم نظر آتا ہے، لیکن گہرائی میں جا کر دیکھیں تو ان میں ایک ربط موجود ہے اور وہ اس طرح کہ ٹولسٹوئی نے اینا کیرینینا کو روحانی گراوٹ اور آخر کار موت کی وادی میں جاتے ہوئے دکھایا ہے جب کہ دوسری طرف لیون ہمیں روحانی بلندی پر جاتا نظر آتا ہے۔

لیو ٹالسٹائی کا ناول ''آنا کارینینا'' اپنی کہانی، کرداروں اور اسلوب نگارش کے نقطۂ نظر سے انیسویں صدی کا ہی نہیں بلکہ بیسویں صدی اور اب اکیسویں صدی کے آغاز میں بھی فن کی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ عالمی کلاسیکی ادب میں اسے جو مقام حاصل ہے وہ بہت کم ناولوں کو نصیب ہوا۔

ناول نگاری کی تاریخ میں اس ناول کو عظیم ترین قرار دینا بے جا نہ ہوگا۔ آنا کارینینا، ٹولسٹوئی کی ماسکو اور سینٹ پیٹرز برگ کے موازنے میں محبت اور ناجائز تعلقات کی قدیم داستان ہے۔ ایک زرخیز اور پیچیدہ شاہکار ناول جو کہ آنا، ایک خوب صورت شادی شدہ عورت اور کاؤنٹ ورونسکی، ایک دولت مند فوجی افسر کے درمیان محبت کے سلسلے کے تباہ کن راستے کا نقشہ کھینچتا ہے۔ ٹولسٹوئی اس کے ساتھ ہی دوسرے درجن بھر کرداروں کی زندگیوں کو بھی باریک بینی سے بُنتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ انیسویں صدی کے اواخر کے روسی معاشرے کو دم بہ خود کر دینے والی گلکاری کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

انیسویں صدی کے روس میں اُبھرنے والا یہ شاہکار ناول توقعات سے وابستہ رہنے کے دباؤ، ایک معاف نہ کرنے والے معاشرے کے حصے اور افراد کے اپنی تقدیر کے پیچھے ذاتی خواہشات کو بیان کرتا ہے۔

ایک مطالعہ جو قاری کو دیے گئے سبق کو نہ بھولنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ دوسرے لوگوں کے تجربات اور غلطیوں سے سیکھنے کو حقیقی معنی دیتا ہے۔ ایک رہنما جو کہ ان خواہشات کی وجہ سے پیدا ہونے والے نتائج کو ایک مثال کے ذریعے دکھاتے ہوئے رہنمائی کی طرف لے جاتا ہے۔

انیسویں صدی کی تیسری دہائی تک روس سے باہر اس ضمن میں کوئی متضاد رائے نہیں تھی کہ روس کے عظیم ترین قلم کار ... ٹالسٹائی نے روسی ادب میں اس طرح سے غلبہ حاصل کیا جیسا کہ Goethe کی وفات کے بعد سے دنیا کی نظر میں بین الاقوامی ادب کو کسی نے متاثر کیا تھا۔

مغربی باشندوں کے اذہان کو جس نے سب سے زیادہ متاثر کیا اور Dostoyevsky کے متبادل کے طور پر جو غیر معمولی شہرت اور ادب کی دنیا میں معروف ہونے والا ادیب تھا تو وہ غیر معمولی تخلیقی قوت کا مالک ٹولسٹوئی تھا۔ ٹولسٹوئی فکشن کے افق پر ایک درخشاں ستارے کی طرح نمودار ہوا۔ اگر ہم ٹولسٹوئی کی ادبی زندگی کے دوامی ہونے کی بات کریں تو اس پر کوئی سوالیہ نشان نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ٹولسٹوئی فکشن کی دنیا میں دوامی زندگی رکھنے والا ادیب ہے۔

حقیقت میں ٹولسٹوئی کی اثر پذیری میں اتار چڑھاؤ تو ہوسکتا ہے: جیسا کہ آج ہم دیکھتے ہیں۔ اس چیز سے انکار بہت مشکل ہے کہ وہ ایک باکمال ادیب تھا اور ایک عظیم انسان بھی، لیکن مجموعی اعتبار سے ٹولسٹوئی کا ستارا کبھی زوال پذیر نہیں ہوسکتا، کہ وہ ایک عظیم ترین انسان تھا (نہ صرف عظیم لوگوں میں بلکہ شاید عظیم تر لوگوں میں بھی ایک عظیم ترین انسان تھا۔) ٹولسٹوئی نے ادب عالیہ میں غیر معمولی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اسی لیے اُسے دوام حاصل رہے گا۔ اس نے اپنی تخیلاتی قوت سے اپنے ناول کو روشن کیا۔ (ٹالسٹائی Freud کے بعد دنیائے ادب پر نمودار ہوا۔ آرٹسٹ اور سائنس دان میں اگر موازنہ کریں تو آرٹسٹ زیادہ تخیلاتی ہوتا ہے جب کہ سائنس دان تجربی علم پر تیقن رکھتا ہے۔)

جنگ اور امن (War and Peace) نہ صرف ضخامت میں بلکہ کاملیت (Perfection) میں ٹولسٹوئی کا شاہکار ہے۔ یہ تمام روسی حقیقت پسندانہ فکشن میں اہم ترین کام بھی ہے اور انیسویں صدی کے یورپی ناولوں کے دائرہ کار میں مساوی حیثیت رکھتا ہے۔ یورپی ناول اس سے برتر بھی نہیں ہیں، اور جدید ناولوں میں اس کی ایسی کوئی مثال جو کہ انیسویں صدی سے پہلے اس کی مخالفت کر سکے، اس کے رقیبوں میں جیسا کہ فلابیئر کا ناول مادام بواری اور Le Rouge et

le Noir کی نسبت زیادہ واضح طور پر (ان مثالوں کو) دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک کام بنیاد گزار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ تاریخ ادب میں چند ضخیم اور لازوال ناولوں میں ٹولسٹوئی کا (War and Peace) ایک اہم مقام رکھتا ہے جو اس کی تصانیف کا تسلسل بھی قائم رکھے ہوئے ہے۔ کئی حوالوں سے جنگ اور امن (War and Peace) ٹولسٹوئی کے سابقہ کاموں کا براہِ راست تسلسل ہے۔

آنا کارینیا اپنے تمام عناصر میں "War and Peace" کا تسلسل ہے۔ دونوں میں ٹولسٹوئی کا طریقہ کار مشترک ہے اور دونوں کا نام ایک ساتھ لیا جاتا ہے۔ "War and Peace" کے کرداروں کے بارے میں کیا کہا جائے وہ بھی آنا کارینیا کی طرح دہرائے جا سکتے ہیں: Anna، Dolly، Kitty، Oblonsky Stiva، Vronsky، کے کردار قسط وار اور ثانوی کردار Natasha اور Nicholas Rostov کی طرح یادگار ہیں بلکہ اس میں بہت زیادہ تنوع ہے اور "آنا کارینیا" کے کرداروں میں زیادہ متنوع ہمدردی اور رنگا رنگی ہے۔ خاص طور پر Vronsky' ٹالسٹائی کی دنیا میں ایک خالص اور بنیادی اضافہ ہے، ٹولسٹوئی کے دیگر کرداروں کی نسبت وہ مصنف سے بنیادی طور مختلف ہے اور جانبدارانہ وژن پر مبنی نہیں ہے، وہ Vronsky اور آنا شاید ٹولسٹوئی کو دوسروں کو سمجھنے کے لیے ایک عظیم ترین کامیابی ہے لیکن جنگ اور امن "War and Peace" کے مخرج Prince Andrew and Pierre کے بجائے لیون اس کے برعکس ہے۔ پہلے کی کہانیوں کے Diaristic Nekhly Udovs کے روزنامچہ نویس (وقائع نگار) اور Olenins کی جانبدارانہ واپسی ہے۔ لیون جانبداری کی طرف واپسی ہے، شروع کی کہانیوں کے وقائع نگار Olenins اور Nekhlyudovs اور وہ کہانی اس طرح سے بُنتا ہے جیسا کہ "War and Peace" میں Platon اور Karatayev کرتا ہے، بالکل اس کے برعکس طریقے سے۔ دونوں ناولوں میں ایک اور فرق یہ ہے کہ "Anna Karenina" میں کوئی علیحدہ فلسفیانہ ابواب نہیں ہیں بلکہ تمام کہانی میں سر پر سوار ہونے والی اور ناگوار طور پر نمایاں اخلاقی فلسفے کو سمویا گیا ہے۔ اور ناول کے بنیادی کام میں نامانوس فرق محسوس کیا گیا ہے۔ "War and Peace" کا بنیادی کام پرسکون اور نمایاں ذائقے اور مہک کا ملا جلا احساس (Flavor) رکھتا

ہے۔ آنا کارینینا کی فلاسفی "War and Peace" کے اندھے اور اچھی زندگی کے خدا کے بجائے ناول آنا کارینینا میں زیادہ رنجیدہ خدا کی رسائی کی طرف ایک نا مبارک تجویز (Suggestion) ہے۔

رنجیدہ ماحول، کہانی کو اور زیادہ عمیق کرتا ہے جو اسے اختتام کی طرف لے جاتا ہے۔ آنا اور Vronsky کا رومانس جو کہ اخلاقی اور معاشرتی قانون سے تجاوز کر گیا اور جذبات و احساسات کو ترفع تک پہنچا دیتا ہے جو پہلے ناول کا جزو لازم نہیں تھا بلکہ اچھے اور عمدہ مزاج کے Levin اور Kitty کا پرسکون رومانس اُلجھاؤ والی پیچیدگی کے پیرائے پر ختم ہوتا ہے۔ ناول صحرا کی ہوا میں ایک اذیت ناک چیخ پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ دونوں ناولوں کا اختتام غیر واضح ہے جب کہ "War and Peace" صرف زندگی کے لامحدود تسلسل کی تجویز دیتا ہے جو کہ دیے گئے بیان کو نامکمل حصے سے الگ کرتی ہے، ''آنا کارینینا'' میں یہ وہ راستہ ہے جو راہ گیر کے قدموں سے پہلے ہی آہستگی سے اپنا وجود کھو دیتا ہے اور درحقیقت ٹولسٹوئی نے ''آنا کارینینا'' کو جب ختم کیا، اس سے پہلے ہی وہ زوال میں داخل ہو چکا تھا جو کہ اس کو منتقلی کی طرف لے گیا۔ ناول کا پیچیدہ اختتام صرف رنجیدہ پیچیدگی کی عکاسی کرتا ہے جس تجربے میں سے وہ گزر رہا تھا۔ وہ ان دونوں ناولوں جیسا ناول دوبارہ نہیں لکھ سکا۔ ''آنا کارینینا'' کو ختم کرنے کے بعد Peter اور Decembrists پر کام کر کے اُس نے اپنے کام کی طرف واپس آنے کی ایک سعی کی، لیکن جلد اس کام کو ترک کر دیا اور اس کے بجائے دو سال کے بعد اپنی آخری عشقیہ کہانی کے اختتام کے بعد اُس نے "A confession" لکھا۔ "Anna Karenina" اخلاقی اور مذہبی زوال کی طرف لے جاتا ہے جو کہ اتنا عمیق تھا جس نے ٹولسٹوئی کی زندگی میں انقلاب برپا کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کو شروع کرتا اُس نے اپنی نظریں پہلے ہی نئے فنکارانہ طریقوں کی طرف لگا رکھی تھیں۔ زائد از ضرورت تفصیل کے نفسیاتی اور تجزیاتی طریقہ کار کو ترک کرتے ہوئے اور ایک سادہ بیانیہ طریقہ کو دریافت کرتے ہوئے جس کو نہ صرف مہذب اور کرپٹ تعلیم یافتہ گروہوں پر بلکہ لوگوں کے غیر ترقی یافتہ اذہان پر منطبق کیا جا سکتا تھا۔ (ٹالسٹائی کی نگاہیں نئے طریقوں، نئے اسالیب اور نئی تیکنیک کی دریافت پر تھیں) وہ کہانیاں جو کہ ۱۸۷۲ میں اُس نے لوگوں کے لیے لکھیں، God Sees the Truth اور The Captive In the Caucasus جو کہ حقیقت میں

غیر رومانوی اصطلاحوں میں محض ایک ترجمہ ہے، پشکن (Pushkin) کی نظم کی ایک طری کی پیروڈی (Parody) ہے۔ اُس نے ۸۶-۱۸۸۵ کی مقبول کہانیوں کا اعلان کیا اور ان کی طرف اخلاقی طور پر بہت زیادہ نشان دہی نہیں کی، لیکن وہ تمام بیانیہ اور عمل (Action) پر اُن کا ارتکاز ہے اور تمام چھپ کر خفیہ باتیں سننے سے یا کن سوئیاں لینے سے مکمل طور پر آزاد ہیں۔

ٹالسٹائی کے زمانے میں روسی معاشرہ اخلاقی، روحانی اور مذہبی بحران پذیری کا شکار تھا۔ اس سوسائٹی کے اخلاقی اور مذہبی بحران کے اثرات ایک عام فرد پر بھی مرتسم ہو چکے تھے، ٹولسٹوئی روسی معاشرے کے ایک نابغہ روزگار فرد کی حیثیت سے ہی اپنے ناولوں میں جلوہ گر ہوا۔ ٹولسٹوئی "War and Peace" اور "Anna Karenina" کے پائے کے ناول لکھنے کے قابل نہیں ہو سکا۔ اس سے پہلے کہ وہ اینا کیرینینا کو ختم کرتا وہ زوال کی دنیا میں داخل ہو چکا تھا جس کا عکس ہمیں اس کے ناول آنا کارینینا کے پیچیدہ اختتام میں بھی نظر آتا ہے۔ اینا کیرینینا میں مذہبی، روحانی اور اخلاقی زوال کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے۔ جس عنصر نے ٹولسٹوئی کی زندگی میں انقلاب برپا کیا اور وہ مذہبی منتقلی کی طرف مائل ہوا۔ ٹولسٹوئی جب "War and Peace" جیسا شاہکار ناول لکھ چکا تو اس عظیم ترین ناول کے بعد اُس نے صرف ایک اور عظیم ترین ناول "آنا کارینینا" کے نام سے لکھا، گو کہ اس کے علاوہ بھی اُس نے متعدد Stories Short حوالہ قلم کیں مگر اس کے ناول "War and Peace" اور "Anna Karenina" عدیم النظیر ہیں۔ عالمی ادب کے اُفق پر یہ دو ناول ٹولسٹوئی کے عظیم ترین شاہکار ہیں۔ ان ناولوں کے بعد وہ کبھی اس سطح کے فنی و فکری پختگی کے حامل ناول نہ لکھ سکا اگرچہ اس نے اپنے فن کی طرف مراجعت کرنے کی بہت زیادہ دانستگی اور ارادی قوت کے ساتھ کوشش کی مگر وہ اپنے ان عظیم ترین شاہکار ناولوں جیسے فن پارے تخلیق کرنے کی کوشش میں کبھی کامیاب نہ ہو سکا۔ یہی دو ناول اس کے فن کے ترفع کے زمانے کی یادگار ہیں۔

روسی معاشرے کے مذہبی اور اخلاقی انحطاط و زوال پذیری کی جھلک "Anna Karenina" کے پیچیدہ ترین اختتام میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

کچھ نام اپنی تخلیقی توانائی کی وجہ سے ایسے ہوتے ہیں جو اپنی سرزمین کی ارتقائی تاریخ میں ایسے سموئے جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کی پہچان بن جاتے ہیں۔ مثلاً روس جو دنیا کی دوسری بڑی طاقت رہا ہے لیونیکولائیوچ ٹولسٹوئی کے نام سے پہچانا جاتا تھا اور اب جب کہ روس دنیا کی دوسری

بڑی طاقت کی بلندیوں سے گر کر چکنا چُور ہو چکا ہے۔ لیوٹالسٹائی کا نام اور شخصیت اُسی طرح مستحکم اور توانا ہے جس طرح اُس کے وطن (روس) کے دوسری بڑی طاقت ہونے کے زمانے میں تھی۔ دنیا میں کہیں بھی ناول نگاری اور روس کا نام آئے گا تو اِن دو ناموں کے مقابلے میں ایک نام ٹولسٹوئی کا ہوگا جس کا پلڑا بھاری ہوگا۔

خود ٹولسٹوئی کی اپنی پہچان ایک ناول نگار کی حیثیت سے ہے لیکن اُس کے اِرد گرد دہریت کا ماحول کس قدر غالب ہو گیا تھا کہ خود ٹولسٹوئی کو اپنی ذات میں روحانی بحران کا اندازہ ہوا اور وہ اخلاقیات، فلسفے اور تدریس کی راہوں پر چل نکلے۔ ٹولسٹوئی اپنے Point of View میں بہت رجڈ (Rigid) تھے۔ یہ اُن کی خامی تھی یا خوبی یہ ایک الگ بحث ہے۔

ٹالسٹائی نے لکھنا اس لیے شروع نہیں کیا کہ وہ شہرت کے متلاشی تھے، دراصل اُن کی ذہنی زرخیزی ایک ایسا زور آور دھارا تھی جس کے آگے وہ خود بھی اگر چاہتے تو بند باندھنا ممکن نہیں تھا۔ اُنھوں نے اپنی معرکتہ الآرا تخلیقات کا سلسلہ جب شروع کیا تو اُسے روکنے والا کوئی نہ تھا یہاں تک وہ خود بھی اِس پر قادر نہیں تھے۔ اُنھوں نے بہت تخلیقی ذہن پایا تھا۔ اُن کے معروف زمانہ تاریخی رزمیہ ''جنگ اور امن'' (War and peace) ایسا ناول ہے کہ عالمی ادب میں دور دور تک اُس کا مقابل نظر نہیں آتا۔ سزا و جزا کے موضوع پر اُن کا ناول (Resurrection) ''نئی زندگی'' بہت مقبول ہوا، لیکن ''آنا کارینینا'' جب شایع ہوا تو اُس کی مقبولیت کے آگے بڑے بڑے ناولوں کا گراف سرنگوں ہو گیا۔ ان کے دونوں ناولوں ''جنگ اور امن'' اور ''آنا کارینینا'' پر ہالی وڈ نے فلمیں بھی بنائی مگر ان فلموں کی وجہ شہرت ہالی وڈ نہیں بلکہ ٹولسٹوئی کا نام تھا۔

ٹالسٹائی کا خاندانی تعلق اُس عہد کے اُمرا اور اشرافیہ سے تھا، بنیادی طور پر وہ جاگیر دار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

یاسیانہ پولیانہ کا وسیع رقبہ ان کی خاندانی جاگیر دار تھا جو بڑا زرخیز اور دریاؤں، خوب صورت پرندوں، لہلہاتے درختوں پر مشتمل تھا۔ ٹولسٹوئی کے ذہن میں ابتدائی عمر میں جاگیر دارنہ برتری کا احساس اور ملکیت کا غرور بھرا ہوا تھا۔ وہ صرف اپنی جاگیر کی زمین کو ہی نہیں بلکہ وہاں رہنے والی اور اُدھر سے گزرنے والی مخلوق کو بھی اپنی ملکیت سمجھتے تھے، جیسا کہ عام جاگیر دارانہ ذہن ہوتا ہے۔ ٹولسٹوئی ظاہراً ایک آدمی تھے، لیکن ان کے باطن میں ایک انسان کی نمو ہو رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُن کے باطن کا انسان اُن کی پوری شخصیت پر غالب آ گیا اور اُن کے ارد گرد رہنے والے لوگ اس تبدیلی کو حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔

ٹولسٹوئی اب ایک روایتی جاگیردار شخص نہیں تھے بلکہ ایک پختہ ذہن انسان میں بدل گئے تھے۔ وہ بڑے دکھ کے ساتھ اُس فرق کو محسوس کرنے لگے تھے جو روس کے عام مفلس لوگوں اور دولت مندوں کے درمیان نظر آتا تھا۔ مفلس انسان جبر، قحط، محکومی، ظلم اور ناانصافی کے ماحول میں موت سے بھی بدتر زندگی گزار رہے تھے۔ اُنھوں نے فن کی تقدیر کو بدلنے کی کوشش کی۔ اُن کا باطن ہی نہیں بدلا بلکہ ظاہر بھی بدل گیا اور لوگ کہنے لگے ٹولسٹوئی تو تارک الدنیا ہو گیا ہے، اِس نے جوگ دھار لیا ہے اور جاگیردار نے اپنی پیدائشی حیثیت کو پیچھے چھوڑ دیا اور مظلوم کی تقدیر بدلنے کے لیے آگے بڑھتے گئے۔ روس کے اشتراکی تناظر میں اصلاحات کے دوران جو ۱۸۶۱ کے دوران وقوع پذیر ہوئیں، اُنھوں نے مزدوروں کا ہاتھ تھاما اور اُنھیں ظلم کے گرداب سے نکالنے کی ٹھان لی۔ وہ کسان کی طاقت بن گئے۔ ٹولسٹوئی کا قلم اور کسان کا ہل اکائی کی صورت روسی ادب میں مظلوم کی دادرسی کا استعارہ بن گیا۔ یہ استعارہ آج بھی روسی ادب کا تشخص ہے۔ اُن کے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ٹولسٹوئی کی عالم گیر حیثیت کو تشکیل دینے میں اُنیسویں صدی کی مسخ سچائیوں کے خلاف ردِعمل اور محروم طبقے کے باغی رُجحانات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

تالستائے کی اس آفاق صفت شخصیت کو سینچنے میں، شاید انیسویں صدی کے باغی رجحانات کا اور زندگی کی مسخ صداقتوں کے خلاف ردِعمل کا حیرت ناک امتزاج کارفرما ہے۔ پشکن اور لیرمنتوف سے لے کر تورگنیف تک روسی ناول نے تاریخ کے شان دار تجربات، تبدیلیوں اور تضادات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔ روسی ادب میں تو تورگنیف کا مشہور نہلسٹ بازار روف افق پر چھا چکا تھا۔ پشکن کے یوگا چیوف اور دوبروسکی کے احتجاجی کردار سامنت شاہی عہد کی اخلاقی قدروں اور سماجی سرحدوں کو توڑنے کا کام شروع کر چکے تھے۔

اِن عظیم اور توانا تخلیق کاروں کی صف میں سب سے نمایاں ٹولسٹوئی نظر آتے ہیں۔ ٹولسٹوئی کے قلم میں اخلاقی جرأت اور معاشرتی نشتر زنی کا جو وصف ہے اُس نے روس کو ایک نئی سمت ایک نئی زندگی عطا کی۔ اُس نے اخلاقی جمالیات کے بہت سی مثالی تحریریں تخلیق کیں جو زمانے کے دامن پر ستاروں کی طرح ٹکی ہوئی نظر آتی ہیں۔ روس کے دوسرے ادیبوں مثلاً گوگول اور چیخوف نے بھی ٹولسٹوئی سے تحریک (Inspiration) لی اور روسی ادب کو فنی اظہار کے زیور سے مالا مال کیا۔ اُردو کے پڑھنے والوں کو ٹولسٹوئی کو اِسی تناظر میں ''آنا کارینینا'' کے المیے کی فہم کرنی چاہیے جس کے ہاں بے انت جذبات کی بے ساختگی بھی ہے اور تقدیر کی زنجیروں کا ظالم شکنجہ بھی ہے۔ ٹولسٹوئی نے ناول کے

آغاز میں ہی لکھا ہے کہ ''اوبلونسکی کا گھرانہ بڑے خلفشار کے عالم میں تھا۔ یہ ایک طرح سے پورے عہد کی آئینہ داری ہے۔ ان حالات کا سایہ خاندانوں اور ان کے اندرونی رشتوں پر پڑ رہا تھا۔ سارا سکون درہم برہم تھا... جذبات میں تناؤ تھا اور مزاج میں برہمی ... توازن بگڑ رہا تھا اور جاگیرداری دور کے اشرافیہ کی قدریں بکھر رہی تھیں''۔ (۱۹)

یہی وہ تناظر اور عمومی فضا تھی جس میں ٹولسٹوئی نے ''آنا کارینینا'' کو جذبات اور اخلاق کے بھنور میں ڈال دیا۔ ٹولسٹوئی کے نزدیک کارنینین خاندان ایک ایسی قیدی تھی جس کے پرندے ہوا میں اُڑ رہے تھے، اُس عہد میں طلاق کا مسئلہ زندگی کے تحفظ کو طوفان کی طرح ہلا رہا تھا اور کارنینین خاندان کی شہرت اور تقدس داؤ پر لگا ہوا تھا۔ ٹولسٹوئی نے مشاہدہ کیا کہ اُس روسی معاشرے میں صرف نئی بصیرت سے کام نہیں چلے گا بلکہ پرانی اقدار کی آویزش سے صورت حال کو بہتر کرنا ممکن ہوگا۔ قدیم معاشرہ جو صدیوں سے احمقوں کی جنت اور خود فریبیوں کے جال میں پھنسا ہوا تھا، اپنی موت آپ مر رہا تھا، لیکن ٹولسٹوئی خاندان کی تقدیس کے طرف دار تھے، امن لیے ان کو جاگیرداروں کا اور اشرافیہ کا گرا ہوا اخلاقی پیکر گھناؤنا لگتا تھا۔ (یہ صورت حال پاکستان کے اُن نوابوں اور جاگیر داروں کے ظلم و جبر والے معاشرے سے بڑی مشابہت رکھتی ہے جو آئین نو سے خوف کھاتے تھے اور نقش کہن کے حصار میں پناہ گزیں رہ کر اپنی بقا کو محفوظ گردانتے تھے۔ یہ صورت حال اُردو کے قاری کے لیے کوئی اجنبی نہیں ہے یہاں بھی ریکس زادے اپنی بوسیدہ روایات اور جبریہ اقدار کی فصیلوں میں متیدرہ کر عیش و عشرت کی زندگی گزارتے تھے۔

یہ سب تو نظروں کے سامنے تھا ہی لیکن دوسری قابل غور بات یہ تھی کہ یہ رجواڑے اور روسا مسائل کو اُس سطح پر دیکھتے تھے جہاں ان کی ذات کے لیے منفعت کا تسلسل جاری رہے۔ ٹولسٹوئی انسانی اقدار کے تحفظ کے لیے معاشرے میں سماجی امن اور اخلاقی رویوں کی موجودگی کو اس لیے ضروری سمجھتے تھے کہ شوہر، بیوی کی اکائی خاندان کی بنیاد ہے جو ہل چکی تھی اور وہ اسے ''آنا'' کی ذات اُس کے خاندان اور اُس کے رشتے داروں کے وسیع حلقے میں تلاش کر رہے تھے مگر حالات کے اس تناؤ میں ٹولسٹوئی کا کردار لیون کی محنت اور مشقت کی اعلیٰ زندگی کا تمنائی تھا مگر وہ زندگی نظر نہیں آ رہی تھی۔ مصنف اُن رشتوں میں سب سے زیادہ استحصالی رویوں کو دیکھ رہا تھا جو صاحب جائیداد اُمرا اور اُس عہد کے کمی کمینوں کے مابین صدیوں سے قائم تھے۔ اِن دونوں کے درمیان قدر مشترک زمین تھی جو ایک کے پاس موجود تھی اور دوسرے کے پاس نہیں تھی۔ ٹولسٹوئی اِس صورت حال کو کرب اور فکر مندی سے دیکھتا ہے اور یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے اُس کی دانش ورانہ مداخلت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

[جاری ہے۔]

پروفیسر سید ریاض حسین زیدی.....ایک بلند پایہ علمی و ادبی شخصیت

پروفیسر سید ریاض حسین زیدی ایک باکمال اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں انھوں نے تمام عمر گلستان شعروادب میں لاتعداد تخلیقی پھول کھلائے اور ان کی دل و جان سے آبیاری کی..... بے لوث خدمت کے جذبے سے سرشار اس بے مثل شخصیت کی علمی، ادبی انتظامی اور دیگر صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف اور گرویدہ ہے.....

پروفیسر سید ریاض حسین زیدی شعبہ تدریس سے 36 برس وابستہ رہے..... بسلسلہ ملازمت وہ جہاں جہاں بھی تعینات رہے انھوں نے ہر جگہ اپنی یادوں اور بے بہا خدمات کے انمٹ نقوش چھوڑے اور اپنے چاہنے والوں کا وسیع حلقہ بنانے میں کامیاب رہے اور ان کے دلوں کی دھڑکن بن گئے.....

مجھے بھی ان سے بہت کچھ سیکھنے کے بے شمار مواقع میسر آئے..... تہذیبی اور سماجی رویوں کی پاسداری کا فریضہ انھوں نے بہ احسن نبھایا ان کے دروازے ہمیشہ آنے والوں کے لئے کھلے رہے اور علم کی ترویج کا سلسلہ جاری و ساری رہا انہیں اگر کسی طالبعلم میں کوئی صلاحیت نظر آئی تو انھوں نے اس کی بہترین انداز میں تراش خراش اور عمدہ انداز میں تربیت کر کے اسے انمول ہیرا بنا کر ہی دم لیا.....

سید ریاض حسین زیدی ایک مجلسی شخصیت ہیں انھوں نے احباب کو جمع کر کے کسی نہ کسی مثبت سرگرمی کو ہمیشہ جاری رکھا اور احباب کی تواضع اور خاطر مدارت کی کوئی نہ کوئی صورت ہمیشہ نکالے رکھی.....

ادبی خدمت کا ایک جنون تھا جس نے تمام عمر انھیں متحرک اور تر و تازہ رکھا..... سال ہا

علی رضا خان

سال سے ماہانہ علمی اور ادبی اجلاس تواتر سے کرانے والی ان کی تنظیم ''ادب سرائے ساہیوال'' آج بھی اپنے تسلسل کو قائم رکھے ہوئے ہے اس پلیٹ فارم نے جہاں نئے لکھنے والوں کی بہترین انداز میں تربیت کی وہاں سینیئرز کو بھی اپنے علمی اور ادبی ذوق کی تسکین کے لئے سازگار ماحول فراہم کیا..... ''ادب سرائے ساہیوال'' کے ماہانہ پروگراموں میں ملکی سطح کی بہت سی بلند پایہ شخصیات بھی شریک ہو کر ان کی رونقوں میں اضافے کا باعث بنتی رہیں.....

سید ریاض حسین زیدی ایک خوبصورت شخصیت کا نام ہے جس میں محبت ہی محبت اور اخلاص ہی اخلاص بھرا ہوا ہے وہ ایک دردمند دل رکھنے والے اور حساس طبیعت کے مالک ہیں انھوں نے ہمیشہ معاشی طور پر کمزور اور ناآسودہ احباب کی نہایت خاموشی سے مدد کی اور مشکل کے ہر موقع پر ان کے ساتھ کھڑے ہوئے...

گورنمنٹ کالج ساہیوال کے عرصہ تعیناتی کے دوران جہاں انھوں نے بڑی جانفشانی سے تدریسی ذمہ داریاں ادا کیں وہاں بطور مدیر اعلیٰ ادارے کے علمی و ادبی میگزین ''ساہیوال'' کی اشاعت میں بھی خوبصورتی کے کئی رنگ بھرے اور کئی یادگار نمبرز کی اشاعت بھی انھیں کی شبانہ روز کاوشوں سے ممکن ہو سکی.....

پروفیسر سید ریاض حسین زیدی کا شمار عہد حاضر کے مستند اور نامور نعت گو شعرا میں ہوتا ہے ان کی نعت عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کئی دلفریب کیفیات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے .....نعتیہ شاعری پر مشتمل ان کے تین مجموعہ ہائے کلام شائع ہوئے جن میں سے دو کو حکومت پاکستان اور پنجاب حکومت کی طرف سے قومی اور صوبائی سیرت ایوارڈ سے نوازا گیا.....

ہماری خوش بختی ہے کہ پروفیسر سید ریاض حسین زیدی جیسی نابغہء روز گار شخصیت ہمارے درمیان موجود ہے ایک زمانے نے ان سے فیض اٹھایا..... ان کے بہت سے تلامذہ اس وقت امتیازی مقام و مرتبے پر فائز ہوتے ہوئے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں۔

اللہ کریم سے دعا ہے کہ وہ پروفیسر سید ریاض حسین زیدی جیسی باغ و بہار شخصیت کو تادیر سلامت رکھے اور وہ اسی طرح مخلوق خدا میں آسانیاں بانٹنے کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے فروغ میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کرتے رہیں.....

اک زمانے کو ناز ہے جن پر
بالیقیں وہ ریاض زیدی ہیں

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر محمد فاروق بھٹی کی نعت نگاری

نعت کی تشکیل میں شاعری کا فنی نظام ضرور کارفرما ہوتا ہے مگر اس کی داخلی صورت جذبوں کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔اس کا تعلق اخلاص، عقیدت، وابستگی اور کیف سے عبارت ہے۔اس امتیازی خصوصیت کی بنا پر نعت عہدِ نبویؐ سے لمحہ موجود تک خیال واسلوب کے نئے نئے پیکروں میں ڈھلی ہے۔سماجی، سیاسی، معاشی اور عصری معاملات موجودہ نعت کا خاصہ ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مسلمان کے لیے حضورؐ اکرم کی ذات بابرکت دُنیا وآخرت کا اثاثہ اور سہارا ہے۔وہ اپنی مشکلات، مصائب، آلام اور معاملات میں حضورؐ سے نسبت کا سہارا لیتا ہے۔نعت گو شعرا کے ہاں نعت میں حمد اور منقبت کی مثالیں عام ملتی ہیں۔استغاثے کی روایت بھی موجود ہے۔جب میں ڈاکٹر محمد فاروق بھٹی کی نعت کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے خالص نعت کے ساتھ ساتھ عصری مسائل ومعاملات کی مثالیں عام دکھائی دیتی ہیں۔اُن کے پیشِ نظر نعت کا خاص قرینہ وضابطہ ہے۔وہ اُمت مسلمہ کے لیے تڑپتے ہیں اور نعت کے ذریعے اظہار کرتے ہیں۔ان کے دس نعتیہ مجموعے ''خوشبوئے رسولؐ''، ''عکس رسولؐ''، ''دیدارِ رسولؐ''، ''جہدِ رسولؐ''، ''انوارِ رسولؐ''، ''ذکرِ رسولؐ''، ''تذکرۂ رسولؐ''، ''احوالِ رسولؐ''، ''شانِ رسولؐ''، اور ''عرفانِ رسولؐ'' شائع ہو چکے ہیں۔ان مجموعہ ہائے نعت سے پتا چلتا ہے کہ نعت سے ان کی رغبت کتنی زیادہ ہے اور ان کے دل میں کس قدر حُبِ رسول پائی جاتی ہے۔خالص نعتیہ پیرایہء اظہار ہمیشہ قائم رہے گا۔عصری معاملات میں تغیر وتبدل پیدا ہوتے رہیں گے۔اِس اعتبار سے نعت میں اوصاف وکمالات، عادات وخصائل اور

شاہد اشرف

سیرت و کردار کا تذکرہ جاری رہے گا۔ جب میں ان کی نعت دیکھتا ہوں تو سرشاری کا پہلو توجہ کھینچتا ہے۔ یہ سرشاری خاص جذت وکیف کی مرہون منت ہے جو گہری وابستگی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

وفورِ شوق سے طیبہ کو جا رہا ہوں
کرم تمہاراؐ کہ قسمت جگا رہا ہوں
ہزار شکر درِ مصطفیٰؐ ہے نظروں میں
یہ وقت آیا کہ نعتیں سنا رہا ہوں میں
(خوشبوئے رسولؐ، ص:۲۸)

ہم جدھر بھی گئے بھٹکتے رہے
تیری جانب جو آئے سنورتے گئے
(خوشبوئے رسولؐ، ص:۱۰۷)

ہمارے شام و سحر ذکر سے مہکتے ہیں
حضورؐ آپؐ کی الفت سے دل ہے یہ معمور
(عکس رسولؐ، ص:۱)

جہاں ہے تپتا ہوا ریگزار، آپؐ چمن
حضورؐ زیست کے صحرا میں ۔۔ سروسمن
(عکس رسولؐ، ص:۴۲)

میں سرفراز ہوا آپؐ کا غلام ہوا
حضورؐ مجھ پہ کرم آپ کا مدام ہوا
(عکس رسولؐ، ص:۷۲)

ولا دھڑکنا ادب سے حضورؐ کا در ہے
جہاں تھے پاؤں نبیؐ کے وہاں مرا سر ہے
(دیدار رسولؐ، ص:۶۶)

کرم حضورؐ کا ہے میرا کچھ کمال نہیں
حضورؐ اپنی ہے قدموں میں آپ کے یہ جبیں
(دیدار رسولؐ، ص:۳۴)

مجھے جو آپؐ کا دورِ سعید مل جاتا
ہمیشہ قدموں میں رہتا سکون دل پاتا
(جہد رسولؐ، ص:۴۱)

ہاتھ اُٹھنے سے پہلے ہم مُراد پاتے ہیں
صبح و شام چوکھٹ پر برکتیں اُترتی ہیں
(انوار رسولؐ، ص:۱۰۵)

مولائے کُل جانِ جہاں
تجھ پر فدا سارا زماں
(ذکرِ رسولؐ، ص:۱۲)

خدا کے بعد فقط مرتبہ حضورؐ کا ہے
خیال کی بھی کہاں دسترس میں ایسا مقام
(شانِ رسولؐ، ص:۳۶)

آپؐ کی برکت سے قائم ہیں زمین و آسماں
آپؐ دافع ہر بلا ہیں آپؐ سے روشن حیات
(احوال رسولؐ، ص:۶۰)

تیرے دربار کی ہے عجب رسم و راہ
دل میں بے تابیاں اور چُپ ہے زباں
(تذکرہ رسولؐ، ص:۶۲)

عطائیں آپؐ کی آقا ہیں بے حساب و کتاب
سخاوتوں کا کوئی آپؐ کی کہاں ہے جواب
(عرفانِ رسولؐ، ص:۲۲)

نعت میں منقبت کا پہلو عام ملتا ہے مگر ڈاکٹر

فاروق بھٹی کی نعت میں یہ پہلو بدرجہ اتم موجود ہے۔وہ اصحاب رسولؐ کے اوصاف صلح جوئی، خیر خواہی، جان نثاری، محبت وانس، بہادری وشجاعت سمیت ہر پہلو سے اظہار کرتے ہیں۔ یوں نعت میں تلمیحی حوالے جابجا نظر آتے ہیں۔ حضورؐ اکرم سے اصحاب کی محبت بطور خاص زیر بحث آئی ہے۔اصحابؓ کی تابع فرمانی اور اخلاص ومسرت کا ذکر بھی ملتا ہے میں ان نعوت کو پڑھتے ہوئے یہ بات محسوس کرتا ہوں کہ ذکر اصحابؓ سے وہ دراصل قاری کو دعوت فکر دیتے ہیں کہ ہمارے سامنے حب نبویؐ کی عملی مثالیں موجود ہیں اور اسی وجہ سے اصحاب رسولؐ کو کامیابی وکامرانی عطا ہوئی ہے۔اور وہ دنیا میں سرخرو ہوئے ہیں۔ہم دنیا میں اس وجہ سے زبوں حالی کا شکار ہیں کیوں کہ ہم نے حب رسولؐ کے تقاضے پورے نہیں کیے ہیں۔

گزر صحابہؓ کے دل میں نہ مال و زر کا تھا
فلک نے دیکھے کہاں اس طرح کے مرد صفا
(احوال رسولؐ،ص:۸)

ابوبکرؓ و غنیؓ ، خالدؓ ، عمرؓ ، علیؓ ، حمزہؓ
بنا وہ گوہر نایاب جو ہوا قدم سے مَس
(عرفان رسولؐ،ص:۲۳)

شکست و فتح سے وہؓ بے نیاز لڑتے تھے
طلب وہ تاج شہادت کی ہی سدا کرتے
(شان رسولؐ،ص:۶۴)

تری دید کا رہا منتظر، تیرا عشق بھی رگ وپے میں تھا
کہ اویس تشنہ کہاں رہا، ترا فیض جس کو مل گیا
(ذکر رسولؐ،ص:۶۸)

وہ سرفراز ہوئے گو کہ تھی نہ دولت پاس
غلام آپؐ کے رکھتے تھے جذبِ ایمانی
(جہد رسولؐ،ص:۱۰۴)

ابوبکرؓ تو محبت کا استعارہ ہیں
خوشا حضورؐ کو ایسے ہیں یار غار ملے
(دیدار رسولؐ،ص:۱۰۶)

جہاں میں آپؐ کے اصحاب منفرد سب سے
بلند اُن کے مقاصد تھے خواہشات قلیل
(عکس رسولؐ،ص:۹۷)

اصحابؓ پاک آپؐ کے تھے اتنے جان نثار
خطروں میں کود کر نہ سوچا کبھی مآل
(خوشبوئے رسولؐ،ص:۱۰۱)

نعت میں استغاثے کی روایت بہت پُرانی ہے،گزشتہ دو صدیوں سے اُمت مسلمہ کے مسائل میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔وقار وعظمت چھن گئے ہیں۔دنیا کی قیادت سے ہاتھ دھونا پڑے ہیں۔مقبوضات کی وجہ سے ظلم وستم کا دُکھ اُٹھانا پڑا ہے۔بوسنیا، چیچنیا، کشمیر، فلسطین، عراق، لیبیا، شام سمیت کئی ملکوں میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا ہے۔ان دگرگوں حالات کا ذمہ دار خود مسلمان ہے۔عاقبت نااندیش حکمران اور بدنیت اکابرین نے آخرت

کے بجائے دُنیا کو ترجیح دے کر ملت کا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔ یہ صورت ایک عام آدمی کے لیے تو اپنی جگہ اذیت کا سبب بنتی ہے۔ ایک شاعر اس لیے ہرگز غافل نہیں رہ سکتا ہے۔ خصوصاً نعت گو شاعر سلگتے مسائل سے توجہ ہٹا کر صرف عشق و محبت میں مدہوش نہیں ہے۔

ڈاکٹر فاروق بھٹی کی نعت کا نمایاں پہلو عصری مسائل کا استغاثہ اور حضورؐ اکرم سے مدد و تعاون کی التجا ہے، اُن کے لب و لہجے میں رجائیت ہے۔ انہیں اُمید ہے کہ یہ دن بدل جائیں گے اور ایک بار پھر اُمت مسلمہ کا عروج ہوگا۔ اللہ کی نصرت اور حضورؐ کی تائید سے اُمت کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرے گی۔ کوئی شک نہیں کہ یہ سب ہمارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے اور ہم در رسولؐ کو چھوڑنے کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

ہوئی ہے اُمت مُسلم نذار و خستہ حال
لعین وقت کو مانا ہے قاضی الحاجات
(خوشبوئے رسولؐ، ص:۷۴)

ہمارا سینہ ہوا چھلنی مٹ گئی ہے نسل
حضورؐ ہم تو فلسطین میں لُٹ گئے ہی مہات
(دیدار رسولؐ، ص:۶۳)

کہ ہم تو شام و فلسطین یہ ہی تھے گر یہ کناں
یمن کی آن پڑی یہ کہاں سے اُفتاد
(دیدار رسولؐ، ص:۶۹)

بقا کی جنگ ہے جاری کرم حضورؐ کا ہو
عطا ہمیں بھی وہی جذبہ بدر کیجیے
(انوار رسولؐ، ص:۸۶)

بھٹکے ہوئے پھرتے ہیں، دشمن کا چلا جادو
رُخ موڑ دیں سب کا، اب سوئے حرم آقا
(شانِ رسولؐ، ص:۱۲۴)

حضورؐ ہاتھ اُٹھا دیں، یقین ہے مجھ کو
مصیبتیں یہ ہماری تو یوں پلٹتی ہیں
(عرفانِ رسولؐ، ص:۱۰۵)

نعت گو شعراء نے اوصاف رسولؐ کو ممکنہ حد تک بیان کیا ہے۔ سیرت رسولؐ کا تذکرہ بھی عام ملتا ہے۔ تلمیحاتی اور استعاراتی سطح پر اظہار کی عمدہ مثالیں بھی موجود ہیں۔ ڈاکٹر فاروق بھٹی کا خاصہ یہ ہے کہ انہوں نے حضورؐ کے کمالات و اوصاف کو نعتیہ مضامین کا خاص عنوان بنا دیا ہے۔ وہ جود و سخا، رحم و کرم، عدل و انصاف، شجاعت و بہادری، ہمدردی و مساوات، فہم و ذکا، شکر و احسان، علم و حکمت اور الفت سمیت سیرت مطہرہ کے تمام پہلو اُجاگر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک نعت کو سیرت سے منور ہونا چاہیے تاکہ اُمت ان خصائل کو اپنائے اور پوری سنت پر عمل پیرا ہو کر دنیوی و آخروی کامیابی ملے۔ یہ خاص پہلو حُبِ نبویؐ کا تقاضا کرتا ہے جس سے زندگی کے اصول مقصد سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ میں نے ان نعوت کے مطالعے میں سیرت مطہرہ

کی مثالیں جا بجا دیکھی ہیں۔

آپ ہیں اپنے خدا کا، باخدا عکس جمیل
آپ ہیں رحم و کرم اور نور داور آپؐ ہیں
(شان رسولؐ، ص:۸۵)

کوئی قانون تھا جاری نہ عدالت کوئی
تیرے آنے سے ہی ایواں میں بہاریں آئیں
(ذکر رسولؐ، ص:۳۵)

آپؐ سالار بے مثال حضورؐ، جاں ہتھیلی پہ آپ رکھتے ہیں
آپ روح جہاد تھے واللہ، آپ اگلی صفوں میں رہتے تھے
(انوار رسولؐ، ص:۸۸)

حضورؐ شاہ و گدا کا مٹا دیا ہے فرق
حضورؐ آپؐ ہی انسانیت کی ہیں معراج
(جہد رسولؐ، ص:۱۰۳)

حضورؐ بات جو کرتے، گلاب جھڑتے تھے
ہے معترف یہ جہاں آپ کی حلاوت کا
(دیدار رسولؐ۔ ص:۱۰۹)

حضورؐ آپؐ سخی، آپؐ کی سخاوت ہے
حضورؐ ہر کوئی در سے بہت ہے خوش جاتا
(عکس رسولؐ، ص:۱۰۶)

آپؐ نے شاہی میں فقیری کی
آپؐ کے فقر و فاقہ پر ہیں نثار
(خوشبوئے رسولؐ، ص:۶۳)

ادا حضورؐ نے جہد و عمل کا حق ہے کیا
بنا کے آپؐ کو بھیجا گیا بشیر و نذیر
(عرفان رسولؐ، ص:۳۵)

خوشا کہ تاج رسالت پہننے سے بھی قبل
امین و عادل و صادق تھے کہتے سب اعلاء
(احوال رسولؐ، ص:۲۸)

جب سخاوت کا ذکر آتا ہے
نام نامی ترا ہی بھاتا ہے
(تذکرہ رسولؐ، ص:۴۷)

نعت میں امکانات کا وسیع و عریض سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ اس بابرکت صنف نے شخصی، جمالیاتی، تلمیحاتی، ذاتی سمیت پر ہر ہر صورت کے ذریعے اظہار کا نمونہ عطا کیا ہے۔ ہر نعت گو اپنے اظہار و بیان کا فرنیہ ساتھ لاتا ہے۔ حضورؐ سے وابستگی انفرادی فضیلت عطا ہو جائے وہ زندگی کے اسرار رموز جان لیتا ہے۔ نعت محض توصیف و تحسین کا ذریعہ نہیں ہے یہ ذاتی و اجتماعی اصلاح کا خاص پہلو رکھتی ہے۔

اس سے خاص ماحول اور فضا تشکیل پاتے ہیں۔ مسلسل نعتیہ ماحول میں رہنے والے خاص فضا کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اُن کے روز و شب مہکتے ہیں اور صبح و شام درود و سلام کا سلسلہ رہتا ہے۔ ڈاکٹر فاروق بھٹی اُن خاص نوازے گئے لوگوں میں شامل ہیں۔ جو ہمہ وقت ایک خاص نعتیہ فضا میں رہتے ہیں۔ مسلسل اور تواتر سے نعت کہتے ہیں اور اسی وجہ سے اُن کی شخصیت اور کلام میں

خاص عجز جھلکتا ہے۔وہ اپنے اردگرد سے باخبر مگر اندرونِ ذات کہیں الگ دنیا میں قیام پذیر ہیں۔یوں وہ خیالات کے پیکر تراشتے ہیں اور کمال صناعی سے اپنے قارئین کے سامنے لائے ہیں۔اللہ ان کی مساعی جمیل کو قبولیت سے نوازے۔

ان کی نعت میں بطور خاص واقعہ کربلا کا حوالہ ملتا ہے۔یہ واقعہ نوع انسانی کی تاریخ میں بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ ہزاروں لوگوں کے اپنی جان دینے کا واقعہ تو ملتا ہے، مگر جب اپنے سامنے خونی رشتے موجود ہوں تو لوگ سمجھوتے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس واقعے کے اثرات نہ صرف ادب بلکہ انسانی زندگی پر بھی دکھائی دیتے ہیں ۔یہ کہنا کوئی غلط نہ ہوگا کہ نوع انسانی کی تواریخ میں سب سے زیادہ آنسو امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کے لیے بہائے گئے ہیں۔ ڈاکٹر فاروق بھٹی اس واقعے کے تناظر میں شجاعت، سچائی، قربانی، غیرت، بہادری، اور جواں مردی کے پہلو سامنے لاتے ہیں اور یوں حضورؐ کے حوالے امام حسین کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

کتنی سج دھج سے گیا تیرا حسینؓ بادقار
معتبر کتنے وہ سجدے ہیں کہ ہم تڑپا کریں
(ذکر رسولؐ، ص:۷۲)

جو کربلا میں بنا دین حق کا پشت پناہ
نواسا آپؐ کا اور آپؐ کا ہے وہ دل بر
(جہد رسولؐ، ص:۵)

حضورؐ کرب و بلا میں حسین دین پناہ
ازل سے تا بہ ابد خونچکاں حکایت ہے
(دیدار رسولؐ، ص:۱۰۲)

ایک اہم بات یہ بھی دیکھی جا سکتی ہے کہ ان کی نعتوں میں مقطع نہیں ہے۔شاید اس طرح اُن کا دھیان نہیں آیا یا وارفتگی، وابستگی اور سرمستی نے انہیں اس طرف آنے ہی نہ دیا۔وہ نعت کہتے ہوئے اپنی ذات کو مکمل طور پر منہا کر دیتے ہیں۔ انہیں نعت عطا ہوتی ہے جو نعت عطا کے درجے پر فائز ہو جائے وہ شاعر کو اپنی ذات سے ماورا کر دیتی ہے۔حضورؐ سے والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے وہ اپنے عجز و انکسار اور فروتنی و عاجزی کے جامے سے باہر نہیں آتے ہیں اور یہ ان کی شخصیت کا خاص وصف بھی ہے۔یہ نعتیں تلمیحاتی، تاثراتی، استعاراتی اور تشبیہاتی طور پر ہنرمندی کی عکاس ہیں ۔ حضورؐ کے اوصاف، شجاعت، جلال، برکات سمیت تمام پہلو نعت کی زینت ہیں اور اہل علم سے داد کے مستحق ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

حامد یزدانی کا شعری مزاج

ہر دور کے شعری مزاج، تقاضے، لفظیات اور پھر اظہار کی علامتیں مختلف ہوتی ہیں۔ شعری مزاج کسی خاص خطے کے سماجی ومعاشی مسائل اور سیاسی حالات واقعات کے زیرِ اثر پرورش پاتا ہے اور پھر وہ خود اپنے اردگرد کے ماحول میں پھیلے خوف اور جبر یا خوش حالی اور کشادگی کے باطن سے اپنی علامتیں اور اظہاریہ خود پیدا کر لیتا ہے۔ اَسّی کی دہائی اور اس کے بعد کے شعری استعاروں اور علامتوں میں ''سفر'' اور اس جیسی دوسری متحرک علامات بہت تیزی سے سامنے آئیں۔ وقت کی تیز گردش، زندگی کے مشینی انداز اور اس کے تحت انسانی رویوں میں بے حسی کے احساس نے باریک بین اور حساس تخلیق کاروں کے شعری مزاج کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ لاحاصلی کے احساس نے مسافت کے نہ ختم ہونے والے احساس کو جنم دیا اور اس حوالے سے بہت عمدہ شعر تخلیق ہوئے۔ حامد یزدانی کا شعری مجموعہ ''ہم ابھی راستے میں ہیں'' ایک ایسے ہی احساس کی ترجمان شاعری ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ ان کے ہاں ''سفر'' دکھائی دینے کے ساتھ ساتھ ہر آہٹ میں زندگی کے لامحدود تجربات اور مشاہدات کے طور پر سنائی بھی دیتا ہے۔ منزل کی طلب، خواہشِ جادہ نہیں رکھتے اور ترکِ سفر کا بھی ارادہ نہیں رکھتے

.....

اک رقصِ سفر پاؤں ٹھہرنے نہیں دیتا
اک دھن کہ مرے سر سے نکلتی ہی نہیں ہے

.....

کہ پھر کانوں میں آغازِ سفر کی گھنٹیاں گونجیں
ابھی تو آئے تھے، دہلیز پر سامان رکھا تھا

.....

یونس خیال

سفر جسمانی ہو یا روحانی سطح کا، جب اس کے دوران لاحاصلی کا احساس جنم لینے لگے تو پیچھے مڑ کر دیکھنا یا رکنا اگرچہ ایک مشکل اور تکلیف دہ امر ہوتا ہے لیکن لاحاصلی کے اس ادراک کے بغیر کوئی بھی فنکارانہ اور فکری طور پر مضبوط بھی تو نہیں ہوتا۔ زندگی کی مسافت میں من چاہے نتائج کی توقع اور پھر آخر میں تہی دامنی کا احساس کسی بھی بڑے فن کار کا سب سے اہم اثاثہ ہوتے ہیں:

تم ہی ساحل کی ہواؤں پہ کوئی نظم کہو
ہم تو سمجھوتہ کیے بیٹھے ہیں گرداب کے ساتھ

.....

ٹھہر تو جاؤں سرِ مرگ دو گھڑی میں بھی
مگر جو پیچھے مرے زندگی پڑی ہوئی ہے

.....

زندگی کی اس مسافت میں اپنے جیسے رواں دواں فطرت کے مظاہر کا بطور علامت چناؤ اس کے تخلیقی کینوس کو مزید وسیع اور پرکشش بنا دیتا ہے۔ ہوا، درخت، پرندے، صحرا، دریا، سمندر، رات، دن، سورج، کشتی، بدلتے موسم اور پھر بہتے آنسو— یہ سب اس کے ہم سفر ہی تو ہیں۔

سارا دن سر پہ لیے پھرتا ہوں سورج اور پھر
میں بھی تھک جاتا ہوں اور رات بھی ہو جاتی ہے

.....

یہ مُردہ شہر کا منظر جو اب بھی زندہ ہے
ضرور اس میں کہیں پر کوئی پرندہ ہے

.....

مرا گھر بہہ گیا کس خامشی سے
یہ دریا ہے کہ چُپ ہوتا نہیں ہے

.....

یہ پرندے ہٹیں تو دیکھوں میں
آسماں کتنا خوب صورت ہے

.....

وہ جس ورق پہ ہمیں بنانا تھی ایک کشتی
اُس اک ورق پر کئی سمندر بنا لیے تھے

.....

ترے مزاج میں صحرا بسا دیا کس نے
غبار پوچھ رہا ہے مجھے بکھرتے ہوئے

.....

عام طور پر لمبی مسافت کو اپنانے والوں کے ہاں ماضی سے جڑی یادیں بس ایک ہلکی سی کسک کا احساس دلاتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ ہجرت کے بدلے میں ملنے والی زندگی کی آسائشوں کو فطرت کا انعام سمجھ کر شعوری طور پر ماضی سے لاتعلق ہو جاتے ہیں لیکن حامد یزدانی کا رویہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ ان کے ہاں اس طرز کی رائیگانی کا احساس نہایت شدید ہے۔ وہ اپنے سفر میں سر پر اپنے ماضی اور یادوں کی گٹھڑی کو اپنا ایک قیمتی اثاثہ سمجھ کر اٹھائے پھرتے ہیں۔ جب

بھی کہیں راہ میں انھیں سستانے کا موقع ملتا ہے
وہ یہ گٹھڑی کھول کر نہ صرف بیٹھ جاتے ہیں بلکہ
اکیلی اکیلی یاد کو چھوتے ہیں، اس کا لمس محسوس
کرتے ہیں، سلیقے سے تہہ کرتے ہیں اور پھر
گٹھڑی باندھ سفر کی اگلی منزل کی طرف رواں
ہو جاتے ہیں۔ سفر کیا گلے پڑاؤ تک وہ کبھی
ہمکلامی کے انداز میں تو کبھی اردگرد کے لوگوں
سے ان یادوں کو مزے لے لیکر بیان کرتے ہیں۔
ان کی یادوں کی پٹاری میں لاہور کی محبت اور
اس سے دوری کا احساس اس قدر نمایاں ہے
کہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے ہاں یہ رویہ
دیکھنے کو ملے۔ ان کی اکثر نظموں کا محور لاہور
میں گزرا وقت اور اس کی یادیں ہیں۔ بلکہ میں
تو کہوں گا کہ ہمارے خوب صورت شاعر کا جسم
اور دماغ زندگی کی کسی بھی مسافت پر ہو دل
صرف لاہور میں دھڑکتا ہے۔ میری اس بات
کی تائید میں ان کی نظمیں ''الوداع''، ''مرے
لاہور - - ایک کولاژ''، ''مزنگ''، ''وہی
سانسوں کا خوشہ'' کے علاوہ اور بھی کئی نظمیں
پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان کی نظم ''ایک نئی مگر
پرانی نظم'' کی کچھ سطریں دیکھیے:

''..... ہاں، لاہور اک شہر کا نام تھا
یا پھر ایک کہانی کا؟
اب کچھ ٹھیک سے یاد نہیں ہے
آئیں! کچھ بھولی بسری خبریں ہی سن لیں
بیٹری سے چلنے والے اس ریڈیو پر
ٹی وی، کیبل، نیٹ کا جھنجھٹ آتے میں کچھ
وقت لگے گا.....''

.....

لاہور کی ایک قدیم ادبی اور سماجی تاریخ ہے
لیکن اس سے وابستگی کا برملا اظہار شاعر کی
وفا اور محبت کا ترجمان ہے۔ خالد احمد کی
وفات پر دکھ کی کیفیت میں لاہور کو یاد کرنے
کا انداز دیکھیے:

کشش وہ لاہور کے ٹھکانوں میں اب نہیں ہے
کہ ایک خالد بھی چائے خانوں میں اب نہیں ہے

.....

حامد یزدانی کا فکری دامن بہت وسیع ہے۔
اسی لیے نظم میں وہ زیادہ توانائی سے کھلتے
اور کھلتے نظر آتے ہیں۔ ''رفتہ صدی کی
آخری شام'' میں مسافت سے تھکن کا
احساس نمایاں ہے۔ ''پناہ گیر'' امید دلاتی
نظم ہے۔ ''خواب اور دعا میں گندھی ایک
نظم'' وطن سے محبت کا احساس دلاتی ہے۔
''دن کا آغاز ہوا'' بہت ہی جاندار نظم ہے۔
اس سے ایک اقتباس درج ہے

''دن کا آغاز ہوا
اک آوارہ دن کا آغاز ہوا
اک آوارہ پت جھڑ جیسا دن آغاز ہوا
لان میں ڈیکے، پیپل کے بوسیدہ پتے اپنی

مٹھی کھولتے ہیں
جانے، کون زبان میں یہ کیا بولتے ہیں!
میں تو اتنا جانتا ہوں
عمر کی ڈھلتی دھوپ میں یادوں کی مٹی بھی سونا لگتی ہے....."

.....

کوئی بھی بڑا تخلیق کار چاہے کتنے ہی مختلف زاویوں اور سانچوں میں خود کو ڈھال لے، ان سب میں اس کے خاص شخصی اور فکری رویوں کا مجموعی تاثر ضرور ملتا ہے۔ حامد کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ اس لیے انھوں نے شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری میں بھی ایک خاص مہارت اور مقام حاصل کیا ہے۔ کہانی کی بُنت، زبان و بیان اور کرداروں کے مضبوط مکالموں نے انھیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کیا ہے۔

"خالی بالٹی اور دوسرے افسانے" ان کے افسانوں کا شاندار مجموعہ ہے۔ "سفر" ان کے افسانوں میں بھی ایک مضبوط علامت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کہانیوں میں بھی چھوٹی بڑی روحانی اور جسمانی مسافتوں کی تھکن کا احساس نمایاں ہے۔ "پیڑ"، "ٹیوب"، "چار سدہ" وغیرہ سب مسافتوں کی شکلیں ہیں۔ "مرغولے" میں ادبی فضا اور بحث و مباحثے کا ذکر نہایت عمدگی سے کیا گیا ہے۔ "حوض" میں مذہبی رویوں پر سوالات اٹھائے ہیں۔ "دھمال" اپنے اندر کے جہان کی کھوج میں نکلے مسافر کا پتہ دیتا افسانہ ہے۔ اس افسانے سے ایک اقتباس دیکھیے:

"اندر توں ایں، باہر توں ایں—
مجھے یقین ہے کہ مولانا روم کے درویش شاہ حسین کا یہ مصرعہ ہرگز نہیں گنگنا رہے پھر بھی جانے کیوں سارے میں ایسی تر و تازہ روشنی پھیلتی جا رہی ہے جیسے اکتوبر میں کہیں سے موسمِ بہار آ گیا ہو— شالامار باغ کے آس پاس— یا شاید— مزنگ کے بے پر بابا عبداللہ شاہ کے مزار کے سامنے باریش برگد کے نیچے — نامعلوموں کی دھمال کھل اٹھی ہو— ڈھول کی تھاپ پر:
دمادم دم— دمادم دم— دمادم— دم
دم دم دم۔
جانے سب مجھے کیوں دیکھ رہے ہیں!؟"

یہ ایک صوفی کا رویہ ہے۔ دنیا کی مسافت سے اوپر— بہت اوپر اپنے من کی مسافت میں نکلے صوفی کا رویہ۔ ایسے سفر اور رویے انہی تخلیق کاروں کے ہاں جنم لیتے ہیں جن پر تخلیق کی سب سے بڑی دیوی مہربان ہو اور حامد یزدانی اُن میں سے ایک ہے۔

☆☆☆☆☆

پاکستان اور پاکستانی ثقافت از ڈاکٹر عادل سعید قریشی

ڈاکٹر عادل سعید قریشی اردو اور ہندکو ادب کے حوالے سے تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ اردو کے ساتھ ساتھ ہندکو زبان ادب کی ترویج و اشاعت میں بھی قابل قدر کردار ادا کر رہے ہیں۔ افسانوی مجموعہ ''چاند روتا سورج'' کے ذریعے ڈاکٹر عادل سعید قریشی اپنے قلم کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ افسانوی مجموعے میں سماجی، سیاسی، مذہبی، نفسیاتی اور تہذیبی حوالے سے اچھوتے موضوعات کی عکاسی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر عادل سعید قریشی کے مضامین کا مجموعہ ''پاکستان اور پاکستانی ثقافت'' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ کتاب کا انتساب پرکشش ہونے کے ساتھ ساتھ متاثر کن بھی ہے۔

''ہر اس پاکستانی کے نام جس نے پاکستان کو اقبال اور قائداعظم کے نظروں سے دیکھا اور سمجھا''

کتاب کی تقریظ میں استاد محترم ڈاکٹر نذر عابد کے اسلوب کی چاشنی نے حسب معمول انفرادیت برقرار رکھی۔

''پاکستان ایک خطہ ارضی ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک نظریہ کی تجسیم ہے، اس نظریے کے مخالفین اور دشمن اس وطن کی نظریاتی سرحدوں کو کمزور کرنے کے لیے کام کر رہے ہیں جن کا مقصد اس کی جڑیں کمزور کرنا ہی نہیں بلکہ اس کو ہمیشہ کے لیے نعوذ باللہ نابود کرنا ہے''

''میں نے کہا'' میں ڈاکٹر عادل سعید قریشی نے اعتراف کیا کہ پاکستان کے بارے میں نئی سوچ، زاویے اور حوالے کا محرک پی ایچ ڈی کا مقالہ ''سید عبداللہ کی نثر میں اسلامی اور پاکستانی عناصر: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ بنا۔ زیر تبصرہ کتاب میں پاکستان اور پاکستانی ثقافت سے مربوط سولہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ہر مضمون موضوع کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہے۔ اول مضمون ''پاکستانیت'' میں ایک سوال کو بنیاد بنا کر پاکستانی اجزائے ترکیبی کی وضاحت کی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا قومیت قوم کے لئے واقعی ضروری ہے؟ اگر قومیت واقعی

راحیلہ خورشید

ضروری ہے تو اسلام نے کیوں امت کا تصور دیا؟ مضمون میں تمام مسائل کا احاطہ کرنے کے بعد اختتام پر یہ رائے پیش کی گئی کہ ہمیں ہر صورت پاکستان کی ترویج کرتے ہوئے جذبہ حب الوطنی کو فروغ دینا ہے۔ کیوں کہ یہی اکیسویں صدی کے چیلنجز سے نمٹنے کا مضبوط ذریعہ ہے۔

دوسرا مضمون ''حب قائد کے چار تقاضے'' کے عنوان سے قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتا ہے۔ ڈاکٹر عادل سعید قریشی نے حب قائد کے چار تقاضے ان الفاظ میں تحریر کئے:

1- پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنایا جائے۔
2- قائداعظم محمد علی جناح کو ایک لیڈر اور انسان کے طور پر لیا جائے۔
3- اسلامی قومیت کو سمجھا جائے اور نئی نسل میں قومیت کے افکار کو منتقل کیا جائے۔
4- قائداعظم کو ان کے فرامین اور تقاریر کے اصل متن میں تلاش کیا جائے۔

تیسرے مضمون میں ''پاکستان اسلام اور اردو: ایک مثلث'' میں مثالوں کے ذریعے واضح کیا کہ اس مثلث کے تینوں حوالوں میں سے اگر کسی ایک کو بھی نقصان پہنچا تو ان مقاصد میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا جن کو مدنظر رکھ کر پاکستان کو حاصل کرنے کی ان گنت قربانیاں دی گئیں۔

چوتھا مضمون اس حوالے سے اہم ہے کہ اس میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ کیا دو قومی نظریہ زائد المیعاد ہو چکا۔؟

مصنف نے سترہ سو بارہ سے مسلمانوں کی حکومت کے سلسلے کو دو قومی نظریے کے ساتھ مربوط کیا اور مختلف مثالوں کے ذریعے دو قومی نظریہ کی پائیداری اور فعالیت پر روشنی ڈالی۔ مضمون بعنوان ''فرامین قائد کی روشنی میں اردو ادب کی صورت'' میں اقوال اور ارشادات سے اردو ادب کے باب میں نئے زاویے پیش کئے گئے۔ مزید یہ کہ قائداعظم کے ارشادات کے ذریعے اسلامیت، دو قومی نظریہ، اسلامی ثقافت کا فروغ، ملی تشخص کی بقا، پاکستانیت کا شعور، معاشرتی شرافتوں کا احترام، مسلمانوں کی عزت اور وقار کا باہمی انحصار اور تعاون کے ذریعے مزید مستحکم کیا جا سکتا ہے۔

مضمون ''علامہ اقبال اور قائداعظم'' میں مصور پاکستان اور بابائے قوم کے احسانات کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ ''بچوں کا ادب اور پاکستانی قومیت کی تشکیل'' میں اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ اردو زبان و ادب میں بچوں کے ادب کو وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق ہیں۔ حالانکہ بچوں کے لئے لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ مضمون ''اردو ایک ہمہ جہت حوالہ'' اس بنا پر انفرادیت کا حامل ہے کہ اس میں اردو زبان کو برصغیر پاک و ہند کی پہچان قرار دیا گیا مزید یہ کہ جدید دور میں رابطے کی واحد مشترک زبان اردو ہی ہے۔ بقول ڈاکٹر عادل سعید قریشی:

''اردو زبان کو یہ ہنرمندی حاصل ہے کہ وہ درپیش مسائل سے نمٹنے کا فن جانتی ہے اور اپنی یک جہتی کو برقرار رکھے ہوئے ہے''۔

''قومی زبان اردو اور ڈاکٹر سید عبداللہ کا نظریہ

بازیافت" میں مضمون نگار نے محب اردو سید عبداللہ کی اردو زبان سے عملی محبت پر سیر حاصل بحث کی۔ سید عبداللہ کی اردو زبان سے محبت کا یہ عالم تھا کہ ان کو بابائے اردو ثانی کے لقب سے نوازا گیا۔ اسی طرح سید عبداللہ نظریہ بازیافت کے بھی قائل تھے، ان کے خیال میں نظریہ بازیافت کی بہترین مثال مسلمانوں کی ہے، جنھوں نے اپنی حکومت کے خاتمے کے بعد بھی حکومت حاصل کرنے کی آگ کو جلائے رکھا۔ سید عبداللہ کا نظریہ بازیافت ادب میں مستند حیثیت کا حامل ہے۔ مضمون نگار ڈاکٹر عادل سعید قریشی نے "دو قومی نظریہ اور ادبی تقاضے" میں اس امر پر زور دیا ہے کہ اردو زبان و ادب کے شعرا و ادبا حال میں درپیش مسائل اور تقاضوں سے قاری کو روشناس کرائیں۔ تاکہ ادب کے ذریعے آنے والے کل کی مثالی صورت نہ صرف متعین ہو بلکہ مسلمان اپنے شاندار ماضی سے بھی متعارف ہو سکیں۔ "فیض احمد فیض کا تصور قومی ثقافت" پر مشتمل مضمون منفرد بھی ہے اور اہم بھی۔ "فیض احمد فیض کا تصور قومی ثقافت" کے متعلق مضمون نگار تحریر کرتے ہیں۔

"فیض احمد فیض کا تصور قومی ثقافت خاص فعال اور حالات کے قریب قریب ہے۔ فیض ثقافت یا کلچر کے لیے تہذیب کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں"۔

فیض احمد فیض اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے کہ اسلامی تہذیب کی بقا کا حل پاکستان کے وجود میں پنہاں ہے اور ثقافت وہ شیرازہ ہے جو وطن پاکستان کے تہذیبی، تمدنی، لسانی، سماجی اور علاقائی مسائل کے بچھڑے دریاؤں کو ایک سمت عطا کر سکتی ہے۔ "پاکستانی ثقافت کے تشکیلی عناصر" میں گزشتہ سے پیوستہ موضوعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مضمون نگار کے مطابق:

"ثقافت کسی بھی قوم کی پہچان اور تعارف کا بہترین وسیلہ ہے"

اس مضمون میں مختلف حوالوں سے پاکستانی ثقافت کے تشکیلی عناصر کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر عادل سعید قریشی تعریف کے مستحق ہیں کہ انھوں نے تشکیلی عناصر کو ضبط تحریر میں لانے کی کامیاب کوشش کی۔ پاکستانی ثقافت کا کلیدی اور اساسی تشکیلی عنصر عقیدہ توحید ہے۔ اعلیٰ اور معتبر ماخذ قرآن و سنت، تطہیر زندگی، نظام اخلاقیات، عبادات، فرد کی تعلیم و تربیت یا کردار سازی، اعتدال پسندی اور میانہ روی، آزادی اظہار رائے، مجلسی زندگی، نظام سیاست، زبان، طرز زندگی، فنون لطیفہ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ان بنیادی تشکیلی عناصر کو پیش کر کے مضمون نگار نے ثابت کیا کہ یہ وہ عناصر ہیں جن کی وجہ سے پاکستانی ثقافت دیگر اسلامی ثقافتوں کے فلک پر چاند کی طرح نمایاں ہے۔ بحیثیت مجموعی "پاکستان اور پاکستانی ثقافت" کی اہمیت کے حوالے سے ڈاکٹر نذر عابد یوں قطراز ہیں۔

"ڈاکٹر عادل سعید قریشی کی کتاب" پاکستان اور پاکستانی ثقافت" اس حوالے کی ایک کڑی ہے کہ جہاں انہوں نے آج کے پاکستان کو اس نظریاتی پس منظر میں دیکھا اور اپنی موجودگی اور آنے والی نسل کے لیے تفکر اور تدبر کا سامان کرنا چاہا"

☆☆☆☆☆

تحقیقی و تخلیقی زاویے

جس درخت سے جتنے زیادہ پھل ہاتھ لگنے کی اُمید ہوتی ہے، اُس پر پتھر بھی اتنے ہی برستے ہیں۔ یہی منظر نامہ ڈاکٹر نثار ترابی کا ہے۔ اپنی کتابوں پر حروف اعتبار لکھوانے والوں کا ایک انبوہ کثیر ہے۔ سینئرز بھی اور نئے لکھنے والے بھی، ان کے گرد جمع رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چار دہائیوں سے شعری حلقوں میں مقبول ڈاکٹر نثار ترابی کا حلقہ احباب نہایت وسیع ہے۔ یورپ، برطانیہ اور خلیج کا شاید ہی کوئی شہر ہو جہاں انھوں نے اپنے شعری مقبولیت کے جھنڈے نہ گاڑے ہوں۔ پاکستان کی متعدد یونیورسٹیوں سے وابستہ ہیں اور زیادہ وقت سفر میں گزارتے ہیں یا پڑھنے لکھنے میں۔

ان کی نئی کتاب ''تحقیقی اور تخلیقی زاویے'' جو 'نیشنل بک فاؤنڈیشن' نے بڑے اہتمام سے شائع کی ہے۔ اس کتاب میں ستائیس مضامین ہیں، جنھیں پڑھ کے خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ شعر کے ساتھ چار دہائیوں پر مشتمل سفر میں، ڈاکٹر نثار ترابی سے تحقیق کے وہ زاویے اور منظر نامے پیش کیے ہیں، جو اردو ادب میں عام تنقیدی رویوں سے سو

نعمان منظور

فیصد ہٹ کے ہیں۔ انھوں نے کسی بھی مضمون میں رعایت نہیں برتی بل کہ ہر مضمون میں ایک نئے پہلو کو سامنے لائے ہیں۔ یہ نئے پہلو ہمارے روایتی تنقید نگاروں کے لیے ایک تازیانے کا درجہ رکھتے ہیں۔

''نعت دریچہ'' پر چند منفرد فقرے ملاحظہ فرمایئے:

''ارشاد شاکر اعوان نعتیہ اشعار میں جس درجے کی متوازن سوچ کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کا ثمر ہے کہ توحید، رسالت، مقام توحید و رسالت، عقیدہ و عقیدت، شعریت اور طریقت تمام کو اپنی جگہ توازن اور تعدل سے رکھا ہے۔''

جناب ''مجید امجد..... ایک مصور'' کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اقبال کے بعد اس نوع کی پیکر تراشی صرف اور صرف مجید امجد کے ہاں ملتی ہے''

جناب انتظار حسین کے بارے میں لکھتے ہوئے ڈاکٹر نثار ترابی کہتے ہیں:

''انتظار حسین کے ساتھ قراۃ العین حیدر کا نام اس لیے لیا جاتا ہے کہ دونوں افسانہ نگاروں نے انسان اور انسانی تہذیب کے بعض مشترکہ المیوں پر جس دردمندانہ کیفیت میں ڈوب کر اپنا باطنی کرب ظاہر کیا ہے وہ ان دونوں فنکاروں کو انسانی درد کے مشترکہ طرز احساس سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔''

یہاں ہم نے صرف چند فقیروں کو دہرایا ہے ورنہ اس کتاب کا ہر فقرہ نہ صرف دوہرانے بل کہ اسے بار بار پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی ہر فن مولا ہیں مگر ان کا ہر فن ادھورا نہیں یہ ایک ذمہ دار قلم کار ہیں۔ اردو کے علاوہ پنجابی، پوٹھوہاری زبان میں شاعری بھی ان کا خاصا ہے۔ ریڈیو پاکستان اسلام آباد سے ملی نغمہ لکھنے پر پہلا ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ لاتعداد ٹی وی اور ریڈیو کے پروگراموں کی نظامت بھی کر چکے ہیں۔ یہاں یہ بات لکھنا ضروری ہے کہ ڈاکٹر نثار ترابی مکمل تحقیق، جستجو اور دلیل کے ساتھ بات کہنے کے عادت ہیں۔ انھیں

وہی تحریر پسند آتی ہے جو حقیقت پسندانہ اور استدلال کے ساتھ ہو، ان کی اپنی تحریریں بھی بڑی فکر انگیز ہوتی ہیں اس لیے کہ ان میں ان کا خونِ جگر بھی شامل ہوتا ہے۔

تنقید میں ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ دوسروں کی تخلیق میں مقصدیت کو تلاش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ تخلیق اچھی ہوتی ہے جو کارآمد اور افادیت کی حامل ہو اور معاشرے کے لیے اصلاح کا سبب ہو..... ان کی تنقید مغرب کی نقالی نہیں ہے۔ یہ کسی کا مذاق نہیں اڑاتے بل کہ انتہائی ہمدردی سے تخلیق کو پڑھ کے اپنی رائے قائم کرتے ہیں اور اچھی باتوں کی برملا تعریف کرتے ہیں۔ انھوں نے طلب اور جستجو کے ذریعے حقائق بیان کر کے الجھن یا سہو کا مداوا بھی کیا ہے۔ ان کا تنقیدی مطالعہ بڑی باریک بینی پر مبنی ہے۔ ان کے دلائل میں وزن بھی ہے۔ انھوں نے اس بات پر توجہ دی ہے کہ وہ اہلِ قلم جن کے بارے میں، ہمارے نقادوں نے بھرتی کے مضامین لکھے ہیں، ڈاکٹر نثار ترابی نے حوالوں کے ساتھ اور نئے زاویوں سے، اُن کی تحریروں کو یوں بیان کیا ہے کہ قاری پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ڈاکٹر نثار ترابی ایک ایسے عالمِ فن ہیں جو شعر اور نثر کی صداقت پر اعتبار کرتے ہیں، اُسے ترازو میں تولتے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب میں جہاں جہاں نمونے کے اشعار یا نثر پارے پیش کیے ہیں اُن کو موضوع اور فن پر اپنے عہد کی سچائی کو پرکھا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اس بات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ شاعر، شاعری اور نثر نگاری کا معاشرے میں کیا مقام ہے، جب یہ علمی، ادبی اور تحقیقی مسائل کا ذکر کرتے ہیں تو ایک سماں باندھ دیتے ہیں۔ اس کتاب کا انداز اور پیشکش نہایت سادہ اور رواں ہے۔ ان کا اسلوب خالص تحقیقی ہے اور اس میں جاذبیت ہے جو دل موہ لیتی ہے ورنہ اکثر تنقیدی کتابیں مختلف تجزیوں سے گنجلک ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر نثار ترابی نے نہایت جامع انداز میں ہر مضمون کو کامیابی سے سمیٹا ہے کہ وہ بوجھ نہیں پھولوں کا ہار محسوس ہوتا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب اردو تنقید میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورگورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا ''افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

میں نے کہا ''شاید اس مرحلے پر یہ ممکن نہ ہو۔ حامد سعید کاظمی وہ سیٹ جیتے یا ہارے آپ کامیاب نہیں ہو سکیں گے اور اس کا اثر تنویر گیلانی کی سیٹ پر بھی پڑے گا۔''

انہیں حیرانی ہوئی۔ کہنے لگے ''آپ کوشش تو کر دیکھیں۔ میرا جہاز لے جائیں اور اس کو یہاں ابھی اسی وقت لے آئیں۔''

عرض کیا ''یہ سعی لا حاصل ہوگی۔ اس مرحلے پر پارٹی چھوڑنا نہ اس کے مفاد میں ہے اور نہ آپ کے۔ البتہ ووٹ پکا ہے۔ وائیں صاحب کا چیلا ہے۔'' میاں صاحب نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ بولے بس زیرلب مسکرا دئے۔

جب میٹنگ ختم ہوئی تو میاں صاحب مجھے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ کہنے لگے "حامد رضا کی وجہ سے مجھے تنویر کو ٹکٹ دینا پڑ گیا ہے اس سے میرا پرانا دوست شیخ رشید ناراض ہو گیا ہے۔ اسے راہ راست پر لے آئیں۔ دوسرا کانجو بھی مجھے اتنا ہی عزیز ہے۔ اگر پیر نصر الدین نہ بیٹھا تو اس کا بھٹہ بیٹھ جائے گا۔ آپ میرا خصوصی پیغام اس تک پہنچائیں اور ہاں آخری بات تو میں بھول ہی گیا ہوں۔ غلام قاسم خاکوانی لندن میں ہے۔ اس کو میرا پیغام بھیجیں کہ وہ فوراً واپس آئے اس کو صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ دینے کا وعدہ کیا ہے۔

جب میں باہر نکلا تو کافی ڈپٹی کمشنر اور ایس ایس پی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ مجھے ہونقوں کی طرح گھورنے لگے۔

شیخ رشید کو میں نے گھر بلوایا۔ وہ اپنے بیٹے طاہر رشید کے ساتھ آیا۔ ہم عقبی برامدے میں بیٹھ گئے۔ میاں صاحب کا ذکر کیا تو مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہے۔ اس کے منہ جو کچھ آیا کہہ ڈالا۔ کہنے لگے "یہ شخص مجھے اپنا دوست کہتا ہے لیکن اس نے میری پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے۔ میں تو شاید الیکشن ہار جاؤں لیکن اس کے چہیتے گیلانی کو کبھی نہیں جیتنے دوں گا۔ برسوں کے مراسم تھے پل بھر میں ختم کر دیے اس سے بڑی بے وفائی اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"چلیے مان لیتے ہیں کہ میاں صاحب نے بے وفائی کی ہے۔ تو کیا اس کا جواب بے وفائی سے دینا ضروری ہے؟"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہو؟" اس نے حیران نظروں سے میری طرف دیکھا۔

انسان کی مجبوریاں بھی تو ہو سکتی ہیں۔ سیاست میں چند مشکل فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔ یہ بھی یقیناً ان میں سے ایک تھا۔ میاں صاحب کا بس چلتا تو وہ یقیناً ٹکٹ آپ کو دیتے۔ شیخ رشید سوچ میں پڑ گیا۔ بڑا اکھڑ مزاج تھا۔ تمام افسر اس سے بات کرتے ہوئے بدکتے۔ بات کرتے ہوئے طبیعت میں ذرا سا تغفس بھی آ جاتا تو فوراً اس کا لب ولہجہ بدل جاتا اور آپ سے تم اور تو تک آ جاتا۔ کبھی کبھی تو تکار بھی ہو جاتی۔ صرف میں ایک ایسا شخص تھا جس کی وہ نہ صرف عزت کرتا تھا بلکہ بات بھی مان لیتا۔

اُس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"فوراً جا کر میاں صاحب سے بغلگیر ہو جائیں۔ باقی رہی الیکشن کی بات تو آپ کا بیٹا جوان ہے قد کاٹھ والا ہے۔ اس کو صوبائی الیکشن لڑائیں۔"

"تو کیا یہ جیت جائے گا۔ جس حلقے کا آپ اشارہ کر رہے ہیں وہ آدھا شہر سے باہر ہے۔ ہم لوگ آج تک میونسپل حدود سے باہر نہیں نکلے۔"

"تو اب نکلیں۔ ویسے بھی یہ درد سر میاں نواز شریف کی ہے۔ جس قسم کی لہر چل نکلی ہے اس میں مسلم لیگ کا الیکشن ہارنا مشکل نظر آتا ہے۔"

شیخ رشید دوسرے دن لاہور جا کر میاں صاحب سے بغلگیر ہو گیا۔

نصر الدین شاہ سے میری ملاقات رات کو ایک

بجے اے سی لودھراں شیخ حامد نواز کے گھر ہوئی۔ میں وہاں اکیلا گیا اور اپنے ساتھ پولیس گارد عمداً نہ لے کر گیا۔ ایس ایس پی کو بھی سادہ کپڑوں میں ساتھ رکھا۔ پولیس کو کبھی بھی مذاکراتی عمل میں شریک نہیں کرنا چاہئے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا لب ولہجہ دھمکی آمیز ہوتا ہے۔ منت سماجت بھی کریں تو یوں پتہ چلتا ہے کہ حکم دے رہے ہیں۔ وردی بذاتِ خود ایک قسم کے نفسیاتی اشتعال کا موجب بنتی ہے۔

شاہ صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔ کچھ دیر تک تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میں نے انہیں میاں نواز شریف کا پیغام دیا۔ میاں صاحب کا کہنا تھا کہ وہ خود الیکشن نہیں جیت سکتے لیکن ان کے کھڑا رہنے سے صدیق خان کانجو ہار جائے گا۔ Rightist ووٹ تقسیم ہو جائیں گے۔ ہزاروں کی تعداد میں ان کے مریدوں کا ووٹ ضائع ہو جائے گا۔ آخر میں سنہری پیشکش کی۔ آپ شرعی کورٹ کے جج بن جائیں کسی عرب ملک میں سفارت قبول کر لیں یا مذہبی امور کے مشیر بن کر ملک وملت اور دین کی خدمت کریں۔

شاہ صاحب بڑے تحمل اور غور سے سب باتیں سنتے رہے۔ جب جواب دینے کی باری آئی تو فرمایا "یہ مجھے بھی علم ہے کہ میں از خود الیکشن نہیں جیت سکتا۔ یہ بھی درست ہے کہ میرے کھڑا رہنے سے کانجو الیکشن ہار جائے گا۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ اس کو ہرانے کے لئے ہی تو میں کھڑا ہوا ہوں۔ یہ بے ایمان اور منافق انسان ہے۔ باقی رہی پیشکش تو میں اسے آفر نہیں سنہری جال سمجھتا ہوں۔ میں ان پڑھ آدمی ہوں۔ جج بن کر قانونی موشگافیاں کیسے کروں گا۔ اس عمر میں میں وطن نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ لطیفہ تو آپ نے سن رکھا ہوگا کہ ہم لوگ اگر سٹیج عبور کر کے بہاولپور جائیں تو اسے پردیس سمجھتے ہیں۔ مشیری کو میں غلامی سمجھتا ہوں۔ ویسے بھی مشیروں کا کام سوائے وزیر اعلیٰ کی خوشامد کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ میں غیر اللہ کے سامنے جھکنا گناہ سمجھتا ہوں۔" وہ چند لمحوں کے لئے رُکے۔ پھر کہنے لگے "شاہ صاحب! میں کسی نواز شریف یا ڈپٹی کمشنر کو نہیں جانتا۔ آپ سیّد بھائی ہیں پہلی دفعہ ملے ہیں۔ میں نے آپ کے متعلق بہت کچھ سن رکھا ہے۔ مجھے سوچنے کا موقع دیں۔" جب آدمی غور وخوض کے لئے وقت طلب کرے تو سمجھیں کہ کچھ نہ کچھ برف پگھلنا شروع ہوگئی ہے۔

جب ان کے مریدوں کو پتہ چلا کہ شاہ صاحب کو ڈی سی نے اندر بٹھا رکھا ہے تو وہ سمجھے کہ شاید زبردستی انہیں بٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دو تین ہزار آدمی اے سی کے مکان کے باہر جمع ہو گئے اور انہوں نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ شاہ صاحب نے باہر جا کر انہیں سمجھایا کہ وہ اپنی مرضی سے آئے ہیں اور کوئی شخص انہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ تب جا کر مشتعل لوگ واپس ہوئے۔ تیسرے دن شاہ صاحب نے مجھے

پیغام بھیجا کہ وہ کانجو کے حق میں دستبردار ہو گئے ہیں۔ جب میاں نواز شریف کو فون پر اطلاع دی تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

غلام قاسم خاکوانی ان دنوں انگلینڈ میں تھا۔ اس کی بیوی کرامویل ہسپتال میں زیر علاج تھی۔ ایک دن اس کا فون آیا۔ اُس نے ٹکٹ لینے سے معذرت کر لی۔ کہنے لگا ویسے تو میرے لئے بڑے اعزاز کی بات ہے لیکن میں بیوی کو چھوڑ کر نہیں آ سکتا۔ کل کلاں اسے کچھ ہو گیا تو میرے رشتہ داروں نے مجھے جینے نہیں دینا۔ اللہ اسے زندگی دے، ہے تو عمر بھر کی ساتھی۔''

میاں صاحب ملتان آئے تو ایئرپورٹ پر میں نے انہیں بتایا کہ خاکوانی نے معذرت کر لی ہے۔ کہنے لگے وقت کم ہے۔ سوچ کر بتائیں کہ کون سا شخص موزوں ہوگا۔

صلاح الدین ڈوگر میرے پیچھے کھڑا تھا۔ ایک چھوٹے قد اور موٹے ناک نقشے کے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا یہ حاجی بوٹا ہے بڑا مسکین انسان ہے، کمیٹی کا کونسلر رہا ہے۔ اس پر احسان کر دیں عمر بھر آپ کے بچوں کو دعائیں دے گا۔ جب رُخصت ہوتے ہوئے انہوں نے نام مانگا تو میں نے اس مسکینہ نما انسان کو بنفس نفیس پیش کر دیا۔ اُس کا قد بت دیکھ کر کہنے لگے ''یہ منتخب ہو جائے گا؟''

''بالکل!'' ملک صلاح الدین ڈوگر بولا ''جتنا یہ اُوپر ہے اس سے دوگنا زیر زمین اس کی جڑیں ہیں۔'' میاں صاحب مسکرا پڑے اور حاجی بوٹے کو ٹکٹ مل گیا۔ قاری حنیف جالندھری اکثر اُس کو دیکھ کر یہ شعر پڑھتا تھا۔

''جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹا ہم نے پالا ہے''

الیکشن کمپین شروع ہوتے ہی لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ میاں نواز شریف کا پلڑہ بھاری ہے۔ اگر بے نظیر نے کامیاب ہونا ہوتا تو اس کو مقتدر حلقے فارغ ہی کیوں کرتے۔ چنانچہ وہ جہاں بھی جاتے والہانہ استقبال ہوتا۔ ایک دن جنرل حمید گل نے بلایا۔ کہنے لگے ''نواز شریف کو کہیں کہ جلسے جلوسوں میں جتوئی کو بھی ساتھ رکھے۔ کل تک تو انہوں نے اسے سر پر بٹھا رکھا تھا اب ایک دم نظر انداز کرنا مناسب نہیں ہے۔''

میں نے لاہور جا کر جنرل صاحب کا پیغام دیا۔ میاں صاحب بولے ''میری تو پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ ہمارے ساتھ رہے لیکن خود ہی شمولیت اختیار نہیں کرتا۔''

چنانچہ پروگرام بنا کہ میاں صاحب لاہور سے ملتان تک الیکشن مارچ کریں گے اور جتوئی بھی ٹرک میں ان کے ہمراہ ہوگا۔ جب جلوس شروع ہوا تو اسی وقت جتوئی کو اندازہ ہو گیا کہ نہ تو میاں نواز شریف اسے سنجیدگی سے لے رہا ہے اور نہ لوگوں کا دھیان اس کی طرف ہے۔ سارا رستہ وزیر اعظم نواز شریف زندہ باد کے نعروں سے گونجتا رہا۔ اس نے بڑی سبکی محسوس کی اور ساہیوال پہنچ

کرنا سازشی طبع کا بہانہ بنا کر ٹرک سے اُتر گیا۔ ملتان پہنچ کر میاں صاحب نے قاسم باغ میں ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کیا اور دوسرے دن جنرل حمید گل سے خفیہ ملاقات کی۔ اس والہانہ استقبال نے جنرل صاحب کی سوچ بھی بدل ڈالی کہ بدلتے ہوئے حالات میں جتوئی کی جگہ کہیں بھی نہیں بنتی تھی۔ وہ واپس سندھ چلا گیا اور اپنے آپ کو حلقے تک محدود کر لیا۔ جس شخص کی سندھ میں پذیرائی نہیں ہو پا رہی تھی اس کو بھلا پنجاب کہاں خاطر میں لاتا۔

لینڈ سلائیڈ وکٹری: الیکن کے متوقع اور مطلوبہ نتائج نکلے۔ مسلم لیگ واضح اکثریت سے جیت گئی۔ ملتان میں صرف ایک سیٹ پیپلز پارٹی کو ملی۔ یوسف رضا اپنے چچا حامد رضا گیلانی کو ہرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس میں بھی بھتیجے کی مقبولیت کو کم اور چچا جان کی آرام طلبی کو زیادہ دخل تھا۔ حامد رضا ہنوز اس کیفیت سے نکل نہ پائے تھے جہاں انہیں بغیر کسی تردّد یا تنگ و دو کے ووٹ اور نوٹ بیک وقت ملتے تھے۔ ایک تو زمانہ کروٹ لے رہا تھا اور پھر مقابلہ کسی غیر سیّد سے نہیں بلکہ گھر کے چراغ سے تھا۔ ان کی سست روی اور آرام طلبی کا یہ عالم تھا کہ ظہیر تاج نے ان کے حلقے کے دس ہزار مزدوروں کو اکٹھا کر کے ان کے اعزاز میں جلسہ کرایا۔ یہ وہاں نہ پہنچے۔ ظہیر آخری وقت تک انہیں تلاش کرتا رہا۔ نتیجتاً جلسہ برخاست کرنا پڑا۔ حاضرین کے درمیان شدید غم و غصہ اور اضطراب پیدا ہو گیا۔ اسی قسم کی سست رویاں ان کی شکست کا موجب بنیں۔

نواز شریف بھی درپردہ انہیں پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے خوشامدیوں اور چکنی چپڑی باتیں کرنے والوں کی ضرورت تھی، یہ برابری کی سطح پر بات کرتا۔ حامد رضا نے ایوب خان اور بھٹو کا دور دیکھا تھا، جب اس تناظر میں نواز شریف سے بات کرتے تو نفسیاتی طور پر ایک خلا سا محسوس کرتے۔ نواز شریف تک بھی ان کے فرمودات اور خیالات کسی نہ کسی طور پہنچتے رہتے۔ سیاسی مجبوریوں کے تحت وہ انہیں دھتکار سکتا تھا اور نہ گلے لگانا چاہتا تھا۔

بہرحال ایک بہت بڑی کامیابی نے میاں صاحب کو وزارت عظمیٰ کی دہلیز پر لا کھڑا کیا۔ وہ وزیراعظم بن گئے اور پنجاب کی وزارت عالیہ ایک بار پھر وائیں صاحب کی جھولی میں آن گری۔

جنرل حمید گل: الیکشن کے کچھ عرصہ بعد مجھے جنرل حمید گل نے بلایا۔ میں ان کی باتوں پر غور ہی کر رہا تھا کہ میرے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے "میں نے سنا ہے جسٹس فضل محمود ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے ساتھ اسلام آباد رہنے لگا ہے۔ اسے میری طرف سے پیغام دیں کہ وہ بھی میاں صاحب کے پاس رہنا چھوڑ دے نہیں تو بڑا خراب ہوگا۔"

میں نے لاہور جا کر میاں فضلی کو پیغام دیا تو

وہ بڑا جز بز ہوا۔ بولا ''کیا بات کرتے ہو۔ نواز شریف میرے بنا کھانا تک نہیں کھاتا، پانی بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ پہلی دفعہ وزیر اعظم بنا ہے۔ اسے ایک قابل مشیر کی ضرورت ہے۔ ایک پنشن یافتہ جج جو اتفاق سے سیاسی ذہن بھی رکھتا ہو اس سے بہتر مشیر کون ہو سکتا ہے؟''

جنرل حمید گل کی پیشین گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ ویسے تو ہر شخص کسی نہ کسی حد تک اوہام کا شکار ہوتا ہے لیکن فضل تو مجموعہ اوہام تھا۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی وزیر اعظم کے سارے بیرے بدلوا ڈالے۔ میاں صاحب کے کان میں وہم ڈال دیا کہ وہ بے نظیر کے آدمی ہیں، اس کے مراعات یافتہ ہیں، کھانے میں زہر بھی ملا سکتے ہیں۔ انہیں امیر المومنین بننے کا خواب بھی اسی شخص نے دکھایا تھا۔ اس وقت تک وزیر اعظم ہاؤس نہیں بنا تھا اور سندھ ہاؤس کو ہی وقتی طور پر سرکاری رہائش گاہ میں بدل دیا گیا تھا۔ کمرہ نمبر ۹ میں میاں صاحب کا مالشیا رہتا تھا اور کمرہ نمبر ۱۰ انہیں تفویض کیا گیا جو تھا تو محض اتفاق تھا لیکن آنے والے واقعات نے ثابت کیا کہ دس نمبریوں کا بالآخر انجام کیا ہوتا ہے۔ جلد ہی میاں صاحب کے مشیر اور وزیر ایک غیر منتخب شخص کی ریشہ دوانیوں، چالاکیوں، پھرتیوں اور ہیرا پھیریوں سے تنگ آ گئے۔ سازش کو ختم کرنے کے لئے بھی سازش کا جال بچھانا پڑتا ہے۔ اس درمیانی عرصہ میں میاں فضلی نے خوب ہاتھ رنگے۔ اپنی لڑکی کو عورتوں کے کوٹہ سے صوبائی اسمبلی کا ممبر منتخب کروا لیا۔ کچھ پلاٹوں پر بھی اپنا استحوانی پنجہ مارا لیکن تاہم کے میاں صاحب کی آنکھ میں حیا تھی اس لئے وہ اسے از خود فارغ نہ کرنا چاہتے تھے۔ خود اس نیک بخت کو نوشتہ دیوار نظر نہیں آ رہا تھا۔ میاں نواز شریف دورے پر گئے تو فضل محمود کو رائی بھر گمان نہ تھا کہ اس کی رخصتی کا فرمان جاری ہو چکا ہے۔ رات کو دوستوں سے گپ شپ کر کے واپس لوٹا تو اس کے کمرے کو بھاری تالا لگا ہوا تھا۔ بڑا حیران ہوا۔ پوچھنے پر گارڈ نے بتایا کہ میاں شہباز شریف کے حکم پر قفل لگا ہے جو کسی صورت نہیں کھل سکتا۔ فضلی کا سامان اندر پڑا تھا۔ نصف شب کا عمل تھا۔ تھوڑی دیر تذبذب کا شکار رہا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر برآمدے میں پڑے ہوئے صوفے پر سو گیا۔ صبح ناشتہ طلب کیا تو پھر وہی ٹکہ سا جواب ملا۔ مایوسی کے عالم میں گاڑی خود ڈرائیو کر کے میریٹ ہوٹل گیا۔ وہاں سے ناشتہ کر کے باہر نکلا تو سرکاری گاڑی کے وہیل پر Clamp لگ چکا تھا۔ میاں شہباز شریف اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ مقصد اسے اسلام آباد سے اس طرح بے عزت کر کے بھگانا تھا کہ دوبارہ ادھر کا رُخ نہ کر سکے۔ فضل نے ٹیکسی پکڑی اور سیدھا ایئر پورٹ پہنچ گیا۔ جب لاہور گھر پہنچا تو اُس کا سامان پہلے پہنچ چکا تھا۔

اس پر بھی شہباز شریف کی تسلی نہ ہوئی اور اس نے رانا نذیر کو کہا کہ وہ فون کر کے اس بات کی تصدیق کرے کہ جج اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکا ہے۔ رانا نذیر نے اسے بتایا کہ لاہور میں اس کی بات ہو چکی ہے۔

الیکشن کے بعد مجھے وزیر اعلیٰ کا فون آیا کہ اس کا دوست اور محسن حامد رضا الیکشن ہار گیا ہے اور بڑا 'اپ سیٹ' ہے۔ اسے جا کر تسلی دو۔ زخم کیسا ہی گہرا کیوں نہ ہو اسے ہمدردی کا مرہم کسی نہ کسی حد تک بھر دیتا ہے۔ میں نے حامد رضا گیلانی کو فون کیا اور بتایا کہ وائیں صاحب کے حسب الحکم میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے "یہ مناسب نہیں، میں خود آپ کے پاس آ رہا ہوں۔" شام کو وہ تنویر گیلانی کو لے کر میرے گھر آ گئے۔ خاصے فکر مند لگتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یوسف رضا نے الیکشن میں دھاندلی کی ہے۔ ان کی شرافت اور تساہل پسندی کا ناجائز فائدہ اُٹھایا ہے اور اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

گیلانی کا کہنا کافی حد تک درست تھا۔ بعد میں یوسف رضا کے اے ڈی ایل جی پہوڑ سے روابط کا پتہ چلا۔ عورتوں کے پولنگ اسٹیشنوں پر بھی اس نے پیشہ ور اور گھاگ قسم کی عورتیں اپنی پولنگ ایجنٹ مقرر کر رکھی تھیں لیکن حامد رضا پر فارسی زبان کا وہ محاورہ صادر آتا تھا:

مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید
بر کلہ خود باید زد

.....

وہ اپنی ہار کے خود مصنف تھے۔ الیکشن میں بیدار مغز رہنا پڑتا ہے کیونکہ اب معجزوں کا زمانہ بیت گیا ہے۔ Eternal vigilance نہ صرف آزادی کی قیمت ہے بلکہ کامیابی کی کنجی بھی ہے۔ ان کی شکست میں ہزیمت کے کئی پہلو نکلتے تھے۔ سارا ضلع جیت گیا تھا اور اس قدر سیاسی قد 'بت اور "منہ ماتھے" والا شخص پٹ گیا تھا۔ شکست بھی اس نونہال نے دی تھی جسے انہوں نے اپنے ہاتھوں میں کھلایا تھا۔ قریشیوں کے لئے وہ سال کا سب سے بڑا تحفہ تھا، گیلانی آپس میں ٹکرا گئے تھے۔

میں نے انہیں سمجھایا الیکشن پٹیشن سے کچھ حاصل نہ ہوگا، مزید بدمزگی اور محرومیت کا احساس اُجاگر ہوگا۔ الزامات ثابت کرنے کے لئے جو شہادت درکار ہے اس کا مہیا کرنا مشکل کام ہے، ویسے بھی فیصلے تک اگلے الیکشن دستک دینے لگتے ہیں۔

"تو پھر میں کیا کروں؟" انہوں نے اس ڈوبتے ہوئے شخص کی طرح میری طرف دیکھا جس کا سارا بدن پانی کے اندر ہو اور ہاتھوں کو ہلا کر مدد طلب کر رہا ہوتا ہے۔

"آپ سینیٹر بن جائیں۔ الیکشن قریب ہیں۔ ٹکٹ آسانی سے وائیں صاحب دلوا دیں

گے ویسے بھی یہ منصب آپ کے مزاج کے مطابق ہے۔''

خوشی کی ایک لہر تھی جو برقی رو کی طرح ان کے بدن میں دوڑ گئی۔ ''تھینک یو ویری مچ شاہ صاحب تھینک یو ویری مچ۔ ایسا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔'' کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ ملا کر گھر چلے گئے۔

دوسرے دن وائس صاحب کا فون آ گیا۔ کہنے لگے ''حامد رضا کو کون سی گدڑ سنگھی سونگھا دی ہے؟ فون پر بہت خوش لگتا تھا۔'' حامد رضا نے ہو سکتا ہے کہ فون پر سینٹری کی بات نہ کی، سوچا ہو گا کہ مل کر بات کروں گا۔

ملتان میں محرم اور میثاق ملتان: ملتان میں محرم خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ پرانے شہر کی گلیاں بہت تنگ ہیں۔ مکانات خستہ اور پرانے ہیں۔ اس قسم کے ماحول میں تخریب کاری کا احتمال بڑھ جاتا ہے۔ شر پسند بڑی آسانی اور سہولت کے ساتھ اپنا ہاتھ دکھا سکتے ہیں۔ چلتے ہوئے جلوس کے جذبات کو بھڑکانے کے لئے ایک اینٹ یا روڑا کافی ہوتا ہے۔ شہر کو اس اعتبار سے بھی انفرادیت حاصل ہے کہ اس کے تعزیے جسامت، ساخت، تزئین و آرائش اور صنعا گری کے لئے پورے برصغیر میں مشہور ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں بڑے تازیے جنہیں اُستاد اور شاگرد کے نام سے معنون کیا جاتا ہے سنی حضرات نکالتے ہیں۔ عسکریت پسند تنظیموں کی تشکیل سے پہلے کافی حد تک مذہبی رواداری تھی لیکن آہستہ آہستہ برداشت کا مادہ کم ہوتا گیا۔

چونکہ تمام مکاتب فکر کے ساتھ ہمارا مسلسل رابطہ رہتا تھا اس لئے ہمیں محرم الحرام کی آمد پر کوئی خاص دُشواری پیش نہ آئی۔ ہم نے افہام و تفہیم سے ایک ضابطہ اخلاق مرتب کیا جسے میثاق ملتان کا نام دیا گیا۔ تمام صوبے میں یہ اس قدر مقبول ہوا کہ حکومت نے اس کو باقاعدہ سراہا اور ایک مرحلے پر ملی یک جہتی کونسل نے اس کو اپنے منشور میں ضم کر لیا۔ اس پر قاری حنیف جالندھری، وزیر غازی، اشتیاق حسین جعفری، مولانا سلطان محمود ضیا، مظہر حسینی، خورشید عباس گردیزی، مولانا عنایت حسین، حامد سعید کاظمی اور دیگر چیدہ چیدہ علمائے کرام کے دستخط تھے۔

ویسے تو محرم کے سب دن مشکل ہوتے ہیں، اس کی آمد سے پہلے بھی تمام روٹوں کا باقاعدہ معائنہ کیا جاتا ہے، صفائی اور حفاظتی انتظامات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ تمام ضلع کو حساسیت کی بنیاد پر A.B.C گروپوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، رینجرز اور پولیس سے فلیگ مارچ کرائے جاتے ہیں لیکن دسویں کے دن انتظامیہ کی سانس حلق میں اٹکی ہوتی ہے۔ اس دن خدانخواستہ کوئی فساد ہو جائے تو اس کی لپیٹ میں سارا ملک آ سکتا ہے۔ ظاہر ہے جس ضلع سے وہ شروع ہوا اُسی پر حکومت کا نزلہ گرتا ہے۔ گو اپنی طرف سے سکہ بند انتظام کیا جاتا ہے لیکن کوئی نہ کوئی سقم کہیں نہ کہیں رہ جاتا ہے۔

دسویں محرم کے شیعہ جلوس بخیریت گزر گئے۔

شام کے وقت میں لان میں ٹہل رہا تھا کہ ایس ایس پی مرزا محمد علی کا فون آیا۔ بولا ''مبارک ہو! شیعہ جلوس بخیریت گزر گئے ہیں۔''

مرزا صاحب نے انتظامی لغت میں بات کی تھی لیکن نہ جانے کیوں میرا ماتھا ٹھنکا۔ دسویں محرم کو مبارک باد! یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ بفضل ربی تعالیٰ تمام جلوس بخیریت اختتام پذیر ہوئے ہیں۔ میں فون سن کر واپس لان میں آ گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ان کا دوبارہ فون آ گیا۔ بولے ''بری خبر ہے۔ کسی نے شجاع آباد میں سنیوں کے جلوس پر گرنیڈ پھینک دیا ہے جس سے دو آدمی شہید ہو گئے کچھ زخمی بھی ہیں۔ مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو واقعہ کربلا کو حق کی فتح سمجھتا ہے۔ ان کے خیال میں امام عالی مقام نے کربلا میں جو قربانی دی تھی اس سے اسلام زندہ ہوا چنانچہ یہ لوگ روز عاشور ماتم نہیں کرتے بلکہ ڈھول کی تھاپ پر گتکا کھیلتے ہیں۔ شام کے وقت ان کے جلوس پر کسی نے گرنیڈ سے حملہ کیا تھا۔ انتظامیہ اور پولیس میں سے کسی کے سان وگمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ ان پر بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ گو پولیس اور مجسٹریٹ ڈیوٹی پر موجود تھے لیکن کسی نے کمال ہوشیاری سے اس طرح گرنیڈ پھینکا تھا جس طرح عباسی خلیفہ منصور کے دربار میں ہسپانیہ کے اموی حکمران عبدالرحمٰن اوّل نے اس کے جرنیل کا سر پھینکوایا تھا۔ سر کو دیکھ کر خلیفہ منصور ہکا بکا رہ گیا اور اچانک اس کے منہ سے وہ الفاظ نکلے جن کی بازگشت آج بھی تاریخ کے مدفن سے سنائی دیتی ہے۔ اس نے کہا:

Thank God, for having placed vast expence of sea between me and the falcon of Quresh.

ہم فوراً شجاع آباد پہنچے۔ شہر میں خاصا اشتعال پھیلا ہوا تھا۔ ہر فریق دوسرے پر شک کر رہا تھا۔ ساری رات ہم جاگتے رہے، ساری رات مذاکرات کا عمل جاری رہا اور صبح کو خدا خدا کر کے معاملہ قدرے ٹھنڈا ہوا۔ اس دوران ٹیلی فون کالوں کا تانتا بندھ گیا۔ چیف سیکرٹری، ہوم سیکرٹری، آئی جی وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ، کمشنر، ڈی آئی جی، وزراء کرام کیا ہو گیا ہے؟ کیوں ہو گیا ہے؟ کیسے ہو گیا ہے؟ غالباً اس ملک میں سب سے آسان اور پرلطف کام جواب طلبی ہے۔ صبح جب ہم تھکے ہارے نیند کے مارے واپس لوٹے تو میں نے ایس ایس پی سے کہا ''مرزا آئندہ مبارک دینے سے پہلے تسلی کر لینا کہ دوسری پارٹی بھی بخیریت اپنی منزل تک پہنچ گئی ہے۔''

[جاری ہے۔]

نوٹ: گزشتہ ماہ ''شاہ داستان'' میں جناب آصف علی زرداری کا نام سہواً شائع ہو گیا، جس پر مصنف اور ادارہ انتہائی معذرت خواہ ہیں۔

غزل

بے رنگ سا، بے روح سا، بے جان سا دن ہے
تا حدِ نظر پھر وہی ویران سا دن ہے

کس گھاٹ اُتر جائیں کہ اس کرب سے چھوٹیں
پھر دِل میں ترازو وہی پیکان سا دن ہے

پھر ہاتھ پہ اک بُھول بھرے پَل سی ہیں کرچیں
پھر فرش پہ ٹوٹے ہوئے گلدان سا دن ہے

اے کاش یہ خاشاک ہی گروی کوئی رکھ لے
کٹیا میں پھر اُترا ہُوا مہمان سا دن ہے

اس مرگِ مسلسل سے اب اُکتا سے گئے ہیں
پَل پَل میں رواں پھر وہی سرطان سا دن ہے

اے چشمِ! زلیخاؤں کو بازار دکھا دے
گلیوں میں پھر اک چاکِ گریبان سا دن ہے

آیا ہے وہ پھر ہاتھ میں کشکول تھمانے
پھر دَر پہ وہی بے سر و سامان سا دن ہے

کب جھنڈ ہیں پیڑوں کے، یہ خیمے ہیں تھکن کے
رستے کی طرح ساتھ پریشان سا دن ہے

اے ہم سفرو! راندۂ درگاہ رفیقو
کیا جانئے کس دھن میں یہ نادان سا دن ہے

یہ رات بھی کیا رات ہے کاٹے نہیں کٹتی
ایک ایک گھڑی ایک بیابان سا دن ہے

خالد اگر آنکھیں نہیں، دامن ہی بچھا دے
اَب چھت پے اُترنے کو یہ سنسان سا دن ہے

خالد احمد

غزل

جلیل عالی

بجھنے لگے چراغ تو گھر کو جلا لیا
سو آندھیوں میں جشنِ تمنا منا لیا

جن کی جبیں پہ شاہ نے کاٹے لگا دیے
لوگوں نے ان کو اپنے سروں پر بٹھا لیا

اک جنّتِ سراب کے بدلے میں کون دے
سو سومنات بھینٹ چڑھا کر خدا لیا

اُس کے لیے یہ عین فراست کی بات ہے
اپنے کہے کو جس طرح چاہا گھما لیا

قابو میں کس طرح دلِ سرکش کو لائیے
وحشی نے جیسے بندِ سلاسل تُڑا لیا

آنکھوں نے ایک عکس اتارا درونِ دل
باغِ خیالِ یار نے کیا کچھ اُگا لیا

کتنے سخن وروں نے فقط حرصِ نام میں
عرضِ ہنر کو ایک تماشا بنا لیا

آساں ہر اک خرابۂ جاں سے گزر گئے
عکسِ جمالِ ماہ لہو میں جگا لیا

غزل

جو ہو چکا وہ سامنے آنا ہے ایک دن
آیا ہے جو یہاں اسے جانا ہے ایک دن

اپنوں سے دور رہ کے نہ کم ہوں گی تلخیاں
کچھ فاصلے ہیں ان کو مٹانا ہے ایک دن

مانا یہ مسئلہ ہے انا کا مگر نہیں!
روٹھے ہوؤں کو پھر سے منانا ہے ایک دن

جو دکھ دیئے ہیں اس نے سنائیں گے ہم کسے
بپتا سنا کے اس کو رُلانا ہے ایک دن

آئینہ دل ہے گرچہ زمانے گزر گئے!
اس کو بٹھا کے ہم نے بتانا ہے ایک دن

سب تلخیاں مٹا کے خموشی سے اپنے گھر
مِنّت کے ساتھ اس کو بلانا ہے ایک دن

جڑ سے نکالنا ہے کدورت کو بے دریغ
یہ فرض ہے جو ہم کو نبھانا ہے ایک دن

بارش کے موسموں کا ذرا انتظار ہے
بوندوں کا رقص اس کو دکھانا ہے ایک دن

اس کے بغیر ہم بھی حسن مطمئن نہیں
کھویا ہے کل جسے اسے پانا ہے ایک دن

حسن عسکری کاظمی

غزل

جا چکے ہیں تمام خواب فروش
رہ گئے اب فقط عذاب فروش

اصل میں تھے وہی سراب فروش
لگ رہے تھے جو انقلاب فروش

کتنے مصروف ہیں کباب فروش !
بھوکوں مرنے لگے کتاب فروش

مَیں ابھی تک شبِ سیاہ میں ہوں
کیا ہوئے میرے آفتاب فروش ؟

ماسک لگنے لگے ہیں چہروں پر
نظر آتے نہیں نقاب فروش

آمریت کے جبر میں لائے
خضر بن کر ہمیں سراب فروش

اک جہالت کا کاروبار سجا
جس میں مصروف ہیں نصاب فروش

رہنمائی تو ان کے بس میں نہیں
یہ بچارے گنہ ثواب فرش

کیکٹس بیچنے لگے ہیں نسیم
شہر میں جتنے ہیں گلاب فروش

نسیمِ سحر

غزل

گھر سے نکلے تھے کہ آئیں گے ستارے لے کر
بیچتے پھرتے ہیں رستوں پہ غبارے لے کر

زندگی ایسی کٹھن راہ گزر ہے جس پر
چلنا ہو جاتا ہے دشوار سہارے لے کر

کہتے ہیں نام کمایا ہے بہت دنیا میں
اس نے الفاظ و خیالات ہمارے لے کر

میں کوئی پیڑ نہیں تھا کہ خبر سن کے مری
بانٹنے مجھ کو چلے آئے ہو آرے لے کر

جتنی تاخیر ہوئی ہے مری شنوائی میں
اتنی مدت میں تو آ جاتے ہیں تارے لے کر

اپنی کیا عید مگر بچوں کی خاطر راحت
کچھ نہ کچھ کرنا پڑا پیسے ادھارے لے کر

راحت سرحدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رگ رگ ایک تصویر ایک امنگ بھرے
اک خوشبو پھولوں میں کیا کیا رنگ بھرے

غزلیں

کہاں اِس دہر کی ہنگامہ آرائی میں رکھا ہے
وہ کیف و کم جو میری بزمِ تنہائی میں رکھا ہے

ہمارے قد و قامت پر نہ جانا گلستاں والو
شجر سارے کا سارا دانۂ رائی میں رکھا ہے

ہم اہلِ فقر ہیں کچھ اور ہی سطحِ یقیں والے
ہمیں موجِ گماں نے اور گہرائی میں رکھا ہے

سنورنے کی فراغت ہی نہیں دی آخری دم تک
ہمیں مصروف اِتنا عالم آرائی میں رکھا ہے

فلک کا ایک پتھر رونقِ ارضِ جہاں لیکن
زمیں کا ایک ٹکڑا چرخِ مینائی میں رکھا ہے

نہ کیوں دل سے لگا رکھیں کلامِ میر و غالب کو
مزا کیا دُوسروں کی خامہ فرسائی میں رکھا ہے

خاور اعجاز

ناصح کی بات مان کے نقصان کر لیا
اُلٹا خراب اپنا بھی ایمان کر لیا

اُس نے کرم نوازی کی حد کر دی رات کو
مَیں میزبان تھا مجھے مہمان کر لیا

آیا جو آج قیس مِرا حال پُوچھنے
دامن کا چاک مَیں نے گریبان کر لیا

پھونکوں سے تو بجھایا نہیں جا سکا مگر
اُس نے چراغ تابعِ فرمان کر لیا

کب زندگی سے فرصتِ یک دو نفس ملی
جو کچھ بھی بن پڑا اِسی دوران کر لیا

کچھ دیر میں ٹھکانہ بدلنے کو ہے ترا
خاورؔ کہو کچھ آگے کا سامان کر لیا ؟

غزل

تنہائی جب تجھ سے لپٹ کر سونے لگتی ہے
رات گئے کمرے میں بارش ہونے لگتی ہے

کبھی کبھی وہ آنکھ خیام دکھائی دیتی ہے
کبھی کبھی اُس سے بھی وحشت ہونے لگتی ہے

ابھی تو گھر میں اُس سے بڑی بہنیں بھی بیٹھی ہیں
کبھی کبھی وہ باپ کو دیکھ کے رونے لگتی ہے

مہماں پھر سے آس کی شمع گُل کر جاتے ہیں
پھر وہ کچن میں جھوٹے برتن دھونے لگتی ہے

وہ کیا جانے بے تعبیری کا جاں لیوا کرب
وہ تو مالا میں ہر خواب پرونے لگتی ہے

لوگوں کو روداد سنا کر اک ناداں لڑکی
اپنے ہی رستے میں کانٹے بونے لگتی ہے

پھر کوئی کشکول تھما دیتا ہے ہاتھوں میں
غیرت جب بھی اپنا دامن دھونے لگتی ہے

طوفانوں سے لڑنے والے کون تھے جانِ انیس!
ہمیں تو ہر چھوٹی سی لہر ڈبونے لگتی ہے

محمد انیس انصاری

غزلیں

بارش میں لطف اور اذیت کا فرق ہے
تیرے مکاں کی اور مری چھت کا فرق ہے

تو بھی ہے میری طرح اسی گوشت پوست کا
لیکن گداز دل کا محبت کا فرق ہے

میری طرح تجھے بھی کڑا عشق ہے مگر
دونوں کے درمیان عبادت کا فرق ہے

تم ہو ازل کی صبح تو میں ہوں ابد کی شام
میرے تمہارے بیچ قیامت کا فرق ہے

صفدر صدیق رضی

ایسا ہی نہیں صرف عداوت نہیں ہوتی
مجھ سے تو محبت پہ محبت نہیں ہوتی

مجھ سے بھی کہیں بڑھ کے ہے دیوانہ تمہارا
وہ شخص جسے مجھ سے رقابت نہیں ہوتی

رونا بھی سسکنا بھی تڑپنا بھی شب و روز
کیا ترکِ محبت بھی محبت نہیں ہوتی

وہ حشر بداماں تھا جوانی سے بھی پہلے
کیا پہلے قیامت سے قیامت نہیں ہوتی

ہم دونوں اس کے عشق میں برباد ہیں مگر
مجھ میں، رقیب میں قد و قامت کا فرق ہے

میرا نہ رنج کر جو میں پہلے گزر گیا
بس ایک دو دنوں کی مسافت کا فرق ہے

اس جسم سے لوٹا ہوں بمشکل میں بدن میں
اب جاں سے گزر جانے کی ہمت نہیں ہوتی

کیا جانیے کیوں دل میں بسے رہتے ہیں پھر بھی
وہ لوگ ہمیں جن سے محبت نہیں ہوتی

غزل

لاکھ اعلان ہو اشجار کی غم خواری کا
سب کو معلوم ہے کردار ہے کیا آری کا

مول قطرے کا چکانے کی بھی توفیق نہیں
شوق لیکن ہے سمندر کی خریداری کا

پھول ہوتے نہیں حاصل کبھی کانٹے بو کر
غیر مشروط نہیں باب طلب گاری کا

عالمِ کیف کو گھٹتے نہیں دیکھا ہم نے
عشق ہے سلسلہ اک ، دائمی سرشاری کا

اس کے افراد کو حدت سے نہ بچتے دیکھا
ذوق جس نسل میں کم کم ہو شجر کاری کا

اپنے حالات نرالے ہی نظر آئے ہمیں
خواب ہم دیکھتے ہیں نیند میں بیداری کا

جس کو پرواز کی رت کہتی ہے دنیا گلزار
وہ ہی موسم ہے پرندوں کی خبر داری کا

گلزار بخاری

غزل

اُسے ہنستے کبھی دیکھا نہیں ہے
مجھے شک ہے کہ وہ زندہ نہیں ہے

لیے پھرتے ہیں سائے ساتھ اپنے
کوئی اس شہر میں تنہا نہیں ہے

دکھائی بھی نہیں دیتا ہمیں وہ
رہائی بھی ہمیں دیتا نہیں ہے

بہت پایاب ہے دریا، ہمیں کیا
ہمیں تو پار ہی جانا نہیں ہے

جہاں پر ہوں کھڑا، آنا پڑے گا
بہت آساں مجھے ملنا نہیں ہے

پکارا تھا کسی نے چل پڑے ہیں
پکارا کیوں ہے، یہ سوچا نہیں ہے

بُری خبریں اُدھر سے آ رہی ہیں
اِدھر کا حال بھی اچھا نہیں ہے

ابھی بچھڑے نہیں ہو تم کسی سے
تمھیں اس غم کا اندازہ نہیں ہے

یہ کیسے آئنے کے روبرو ہوں
مرا چہرہ مرا چہرہ نہیں ہے

یہ محرومی کا شکوہ کس لیے ہے
جسے سوچا تو ہے ڈھونڈا نہیں ہے

یہ ممکن ہے تجھے مَیں مان ہی لوں
میاں فی الوقت تو ایسا نہیں ہے

وفا کی کس لیے باتیں یہاں پر
وفا اس شہر کا پودا نہیں ہے

چلے جاؤ اگر سوچا ہے عظمی
کسی نے راستہ روکا نہیں ہے

اسلام عظمی

غزلیں

آزاد غزل، مکالماتی آزاد غزل اور نثری غزل کے بعد ثلاثی غزل کے تجربات کے پیچھے میرا مطمع نظر یہ ہے کہ غزل کی ہیئت میں وسعت لا کر ایک تو شعر کے تخلیقی عمل کو کشادگی بخشی جائے اور دوسرا التزام کے اہتمام کے تحت شعر لکھنے والوں کو یکسانیت سے بچانے کے لیے ایک وسیع کینوس مہیا کیا جائے تا کہ ایک طرف تو صرف مشق کی بنیاد پر شعر کہنے والوں کو ایک نیا میدان فراہم ہو اور دوسری طرف تخلیقی استعداد سے سرشار شعرا کو نئے افق میسر آئیں۔ ثلاثی غزل کا مطلع تین مصرعوں پر مشتمل ہے جس میں تیسرا مصرعہ پہلے دو مصرعوں کے ردیف سے بطور قافیہ طرح ہو۔

تجھے غرض ہے سکندر کی بود و باش کیساتھ
تو کیا چلے گا قلندر کی بود و باش کے ساتھ
مگر سے تو بدلتا ہے ارتعاش کیساتھ

تو جو پہن، جو لگا، دکھا مگر انساں
حسین ہوتا ہے اندر کی بود و باش کیساتھ

اسے انا سے یا دانائی سے غرض کیوں ہو
جڑا ہوا ہے جو بندر کی بود و باش کیساتھ

خدا نے خیر کو جوڑے رکھا شرافت سے
اور اقتدار کو رکھا ہے بدقماش کیساتھ

کبھی کبھی تو یہ لگتا ہے زندگی میں نے
گزار دی ہے کرائے کی ایک لاش کیساتھ

کہ مجھ کو ان کے مظالم کا ہوش ہی نہ رہے
مجھے لپیٹ کے رکھا گیا معاش کے ساتھ

فرحت عباس شاہ

درد اور سانس کا سنجوگ بھلا کیا ہوگا
میرے جینے سے بڑا جوگ بھلا کیا ہوگا
سوچتا ہوں کہ وہ کچھ سوچ کے لکھتا ہوگا

آج تک کر ہی نہیں پایا کوئی اس کا علاج
موت سے بڑھ کے کوئی روگ بھلا کیا ہوگا

مجھسے کہتا ہے خدا مر گیا میرے نزدیک
میں پریشاں ہوں کہ اب سوگ بھلا کیا ہوگا

تو جو کر سکتا ہے کر لے میری تقدیر کیساتھ
میری جانب سے ترے جبر کا چرچا ہوگا

میں کہیں سے ابھی زندہ ہوں ابھی جاگتا ہوں
جانتا ہوں کہ یہ تیرے لیے دھچکا ہوگا

میری گردن پہ بناتا ہے شکنجے کا جواز
میرا ہر لفظ جو میں نے ابھی سوچا ہوگا

غزل

واقعہ تھا کہ مجھے وہم ہُوا ہے کوئی؟
رات بھر میرے تعاقب میں رہا ہے کوئی

کوئی رقصاں ہے مرے صحن میں پائل پہنے؟
یا مرے ذہن میں زنجیر بپا ہے کوئی؟

یاد کرتا ہوں، تو سو چہرے چمک اُٹھتے ہیں
اپنی آواز یہاں چھوڑ گیا ہے کوئی

جب سے احساس ہوا ہے کہ اکیلا ہوں میں
بن کے دیوار، مری رہ میں کھڑا ہے کوئی

کیوں نہ چاہُوں کہ مرے بعد مرا نام رہے
موت ٹل جائے، بھلا یہ بھی دعا ہے کوئی؟

یہ جو اک لمحے کو آنکھیں مری جل اُٹھتی ہیں
تیرگی میں کہیں جگنو سا چھپا ہے کوئی

کیوں نہ اک بار درِ عرش پہ دستک دی جائے
سُن تو رکھا ہے کہ جمشید، خدا ہے کوئی

جمشید چشتی

غزل

آؤ کر لیں مکالمہ کوئی
مل ہی جائے گا راستہ کوئی

وہ اٹھاتا ہے یا گراتا ہے
جب بھی ہوتا ہے حادثہ کوئی

ایک پیمانہ یہ بتاتا ہے
زیست کتنے برس جیا کوئی

میری غزلیں مجھے سناتی ہے
مجھ میں رہتی ہے گائیکہ کوئی

جانچتا ہے مرے خیالوں کو
مجھ میں رہتا ہے دوسرا کوئی

دل کی رہ سے گزر ہوائے سخن !
تار دل کا مرے ہلا کوئی

منظور ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دم سادھ کے دیکھوں تجھے، جھپکوں نہ پلک بھی
آنکھوں میں سمولوں، ترے لہجے کی دمک بھی

غزلیں

فکر و تدبیر سے نکلتا ہے
پاؤں زنجیر سے نکلتا ہے

زنگ آلود ہے مگر پھر بھی
خون شمشیر سے نکلتا ہے

پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتا
جو بھی تصویر سے نکلتا ہے

لوگ اس کو اُلٹ سمجھتے ہیں
خواب تعبیر سے نکلتا ہے

صرف لگتا نہیں ہے سینے میں
اشک بھی تیر سے نکلتا ہے

یاد رکھنا مسافرانِ غزل
راستہ میر سے نکلتا ہے

پھر بناتا ہے دل میں گھر اقبال
شعر تاثیر سے نکلتا ہے

اقبال سروبہ

برسوں دِکھا کے خواب سہانے کدھر گئے
جن سے تھا ہم کو پیار نجانے کدھر گئے

بُلبُل، گلاب، جگنو، فضائیں اُداس ہیں
چاہت بھرے وہ شوخ ترانے کدھر گئے

جانے وہ صبر و شکر کی نعمت کہاں گئی
وہ لوگ، وہ نگر، وہ زمانے کدھر گئے

خاموشیاں سجی ہیں لبوں کے مزار پر
ہونٹوں پہ زندگی کے ترانے کدھر گئے

اقبال اُس کو آج رقیبوں میں دیکھ کر
سوچا کہ وہ وفا کے فسانے کدھر گئے

غزل

سورج اگر نہیں ہوں، ستارا تو میں بھی ہوں
لمبی سیاہ شب کا سہارا تو میں بھی ہوں

بے کار سر پٹختا ہے کیوں دوسری طرف
دریا کو یہ بتاؤ، کنارا تو میں بھی ہوں

تعمیرِ قصرِ عشق میں کام آؤں گا کبھی
کنکر ملا ہوا سہی گارا تو میں بھی ہوں

تو نے جسے منافع سمجھ کر کیا قبول
اس شخص کی طرح کا خسارا تو میں بھی ہوں

اس وقت تم زمانے کی باتیں سُنا کیے
جب میں یہ کہہ رہا تھا تمھارا تو میں بھی ہوں

مجھ کو کسی شمار میں لے آ فلک نژاد
ٹوٹا ہوا سہی پہ ستارا تو میں بھی ہوں

چپ چاپ چھوڑ جاؤں گا اک روز میں تجھے
دنیا ترے فریب کا مارا تو میں بھی ہوں

طالب تری طرح میں شکستہ نہیں ہوا
بازی بساطِ عشق پہ ہارا تو میں بھی ہوں

طالب انصاری

غزل

کاٹا ہے اس طرح خطِ تقدیر نے مجھے
باہر نکال پھینکا ہے تصویر نے مجھے

کل سو گئی تھی خواب کوئی دیکھتے ہوئے
آ کر جگایا خواب کی تعبیر نے مجھے

یوں تو ہجومِ دوستاں میں تھی گھری ہوئی
گھائل کیا یہیں کہیں اِک تیر نے مجھے

دن ہیں کبھی کے چھوٹے کبھی راتیں مختصر
بتلا دیا ہے وقت کی تحریر نے مجھے

جب بھی اُٹھائی ریت کی دیوار پیار سے
پھر منہدم کیا مری تعمیر نے مجھے

میں نے تو صرف پیار کیا تھا مرے حضور
بدنام کر دیا اسی تقصیر نے مجھے

میں نے غمِ حسینؑ میں اشکوں کی نذر دی
غم سے بچایا ہے اسی تاثیر نے مجھے

شبہ طراز

غزل

ایک پتھر پگھلنے والا تھا
موم بن کر وہ جلنے والا تھا

ہاتھ کیسے ہٹاتا سینے سے
کوئی دل سے نکلنے والا تھا

بات اشکوں نے روک دی ورنہ
جذبہ لفظوں میں ڈھلنے والا تھا

ہم سے مہروں کی کیا بساط یہاں
ہر کوئی چال چلنے والا تھا

دونوں جانب تھیں مشعلیں صاحب
شہر کا شہر جلنے والا تھا

آنکھ کا مر چکا تھا پانی اور
ہر کوئی آگ اگلنے والا تھا

سعد کسبِ کمال کیا کرتا
وہ جو ٹکڑوں پہ پلنے والا تھا

سعد اللہ شاہ

غزل

رُت بدلنے کا اشارہ ہے یہ طوفانی ہوا
موسموں کی خوب کرتی ہے نگہبانی ہوا

تُو فقط جھونکوں کے ہنگامے سے اپنے رکھ غرض
تُو کہاں سمجھے گی میرے دِل کی ویرانی ہوا

بند کر لو سب جھروکے آج خوں جم جائے گا
سرد شب میں چیختی پھرتی ہے برفانی ہوا

جھوم اُٹھے اشجار برگ و گُل سبھی سرشار ہیں
جنگلوں سے کھیلتی پھرتی ہے مستانی ہوا

خاک اُڑاتی ہے وطن میں خشک سالی آج کل
بادلوں کو کھینچ لا ، برسا یہاں پانی ہوا

جسم و جاں مسحور اس کی سرسراہٹ سے ہوئے
حُسن سے انجان ہے اپنے یہ انجانی ہوا

تو نے بھی لہرایا اُن کا خواب جیسا پیرہن
مجھ سے بھی ہونے کو تھی ہلکی سی نادانی ہوا

مٹی پانی پھول بادل چاند تارے آفتاب
رونقیں سب کی ہیں پر تیرا کہاں ثانی ہوا

کل تلک گلشن میں تیرے جھگڑوں کا شور تھا
جانے اپنے دِل میں تو نے آج کیا ٹھانی ہوا

یاد آیا رشتۂ بیگانگی اُن کا حریم
موسم گُل میں چلی جب جانی پہچانی ہوا

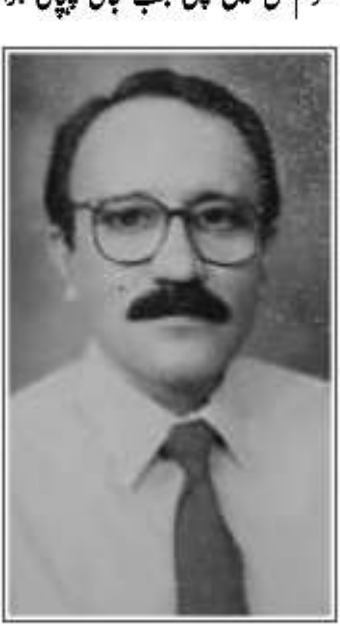

حریم حیدر

غزل

عشق نے خوب ہمیں زمزمے اشکوں کے دیے
عمر بھر آنکھ میں جلتے رہے اشکوں کے دیے

ایک منظر ہی رہا قریۂ ہجراں کا سدا
خون کی آنچ سے جلتے رہے اشکوں کے دیے

ہم نے اک عمر شبِ غم سے لڑائی کی ہے
اپنی آنکھوں میں جلائے ہوئے اشکوں کے دیے

عشق نے بخشا ہے انعام مجھے زخموں کا
اس ستم گار نے تحفے مجھے اشکوں کے دیے

دل نے ورثے میں اگر غم کی عمارت چھوڑی
مقبرے دیدۂ خوناب نے اشکوں کے دیے

غم تو غم ہے کہ خوشی میں بھی نکل آتے ہیں
بھول جاتے ہیں سبھی ضابطے اشکوں کے دیے

منزلیں میری ہیں روشن تو سبب آنسو ہیں
کہکشاں کرتے ہیں سب راستے، اشکوں کے دیے

عقل نے مجھ سے کہا آنکھ کو پتھر کر لو
دلِ سادہ نے مگر مشورے اشکوں کے دیے

خالدہ انور

غزلیں

چھن گیا ایک سہارا جیسے
اب نہیں کوئی ہمارا جیسے

یہ جو چپ چاپ سا خود میں گم ہے
دل بھی ہے بخت کا مارا جیسے

رات پھر خواب میں صحرا دیکھا
مل گیا غم کا اشارہ جیسے

مٹ گئی آس ترے ملنے کی
جل بجھا ایک ستارا جیسے

ایک آواز سی گونجی دل میں
دور جا کر وہ پکارا جیسے

غم سے بے چین طبیعت بدلی
مر گیا سوچ کا دھارا جیسے

خوش ہوئے ترکِ مراسم سے شفیق
بوجھ سینے سے اتارا جیسے

شفیق احمد خان

بچھڑے تو زندگی کے جھمیلے میں کھو چکے
کیا کیا تھے لوگ قصۂ پارینہ ہو چکے

افسانہ ہو چکیں سبھی ماضی کی لغزشیں
جتنے تھے داغ اپنی جبینوں سے دھو چکے

جو زندگی اساس تھے واپس نہ آ سکے
کس کو بتائیں ہم یہاں کس کس کو رو چکے

ممکن نہیں حیات کبھی ہو نا بارور
ہم نخلِ خواب بانجھ زمینوں میں بو چکے

اک سیلِ یاس اپنے بہاؤ میں لے گیا
اک کشتیِ اُمید تھی کب کی ڈبو چکے

کیا کیا نہ تیرے عشق میں الزام لگ گئے
کیا کیا نہ لوگ خارِ ملامت چبھو چکے

دیکھو شفیق زندگی آگے نکل گئی
اب جاگ بھی اٹھو کہ بہت دیر سو چکے

غزل

کھلا یہ راز ترے اوڑھنی بھگونے پر
کہ میرا نام نمایاں تھا ایک کونے پر

وہ جس کے ہجر میں یہ دل ملول رہتا تھا
ملال تک نہ ہوا آج اس کے کھونے پر

کنارِ چشم نمی تک کا شائبہ بھی نہیں
مگر یہ دل کہ بہت مطمئن ہے رونے پر

میں خود ہی ہار گیا اس سے عشق کی بازی
یہ کھیل ختم ہی ہونا تھا اک کھلونے پر

کسی کا ہونا نہ ہونا نصیب ہے لیکن
کئی سوال اٹھے تھے ہمارے ہونے پر

اے کاش اس کی کہانی کوئی سنائے شکیل
جو پھول ٹوٹ گیا تھا لڑی پرونے پر

شکیل اختر

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

اپنی پرستش میں گم تھا ہر کوئی خالد
شہر نہ تھا، معبدِ بتانِ انا تھا

غزل

مزاج یار ہے برہم ابھی تک
وہی پہلا سا ہے موسم ابھی تک

جدھر دیکھو سنائی دے رہا ہے
تری آواز کا سرگم ابھی تک

نہ کوئی معجزہ دکھلا سکا ہے
ہمارے زخم پر مرہم ابھی تک

نمایاں جس میں ہے تصویر تیری
اٹھا رکھا ہے وہ کالم ابھی تک

غزل گرچہ مکمل ہوگئی ہے
مگر چشم غزل ہے نم ابھی تک

مرا دم ، دم میں نکلا چاہتا ہے
نہیں پہنچا مرا ہمدم ابھی تک

وہ زلفوں کو سنوارے جا رہے ہیں
نہیں نکلا ہے دانش خم ابھی تک

اعجاز دانش

غزلیں

یہ بھی کیا سکھ سے ایک دن نہ رہیں
زندگانی سے مطمئن نہ رہیں

اس زمیں پر بشر کا حوصلہ ہے
ایسے حالات میں تو جن نہ رہیں

باوجود اس کے رہنا پڑ رہا ہے
ورنہ اک پل بھی تیرے بن نہ رہیں

رہنا ہے بوڑھی ماں کے پہلو میں
جن کو آتی ہے اس سے گھن نہ رہیں

آتی جاتی رہے بہار و خزاں
اور گنتی میں سال و سن نہ رہیں

رخشندہ نوید

عین ممکن ہے اُسے کچھ یاد آئے دیکھ کر
وہ بھری محفل میں ہم کو مسکرائے، دیکھ کر

کھل اُٹھی رنگت جو دیکھا روبرو چہرہ وہی
دِل پہ قابو ہم بھی اپنے رکھ نہ پائے، دیکھ کر

ترکِ الفت پر تو ہم قائم تھے لیکن کیا کریں
ان کی خواہش دِل میں اب بھی سر اُٹھائے، دیکھ کر

ہم بزعمِ خود انا نے سوچ کر آئے تھے کیا
وہ پگھل کر موم ہو، وہ مان جائے، دیکھ کر

جانے کس دشمن کا ہے یہ مشورہ کہ بزم میں
غیر کی جانب ہمارا دِل دُکھائے، دیکھ کر

دل ہمارا دھڑکا رخشندہ اچنبھا تو نہیں
شاخ پر پنچھی بھی اُن کو پھڑ پھڑائے، دیکھ کر

غزل

تری تلاش میں ایسا بھی ایک پل آیا
میں کائنات سے باہر کہیں نکل آیا

پہنچ چکے تھے ہم آبِ بقا کے چشمے تک
ہمارے ہاتھ میں جب ساغرِ اجل آیا

جو میرا حال نہ بدلا تو جا کے ماضی میں
میں واقعات کی ترتیب ہی بدل آیا

بگولوں سے بھی نہ آیا ہوا کی لہروں میں
جو ایک تتلی کی پرواز سے خلل آیا

گیا تھا حمد کے زینے سے وہ بلندی تک
گرا خدا کی نظر سے تو منہ کے بل آیا

میسر آئی تھی قوتِ فرار کی شاہد
مکاں زماں کے کناروں سے میں نکل آیا

شاہد ماکلی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی مجھے سنوار رہا ہے تراش کر
پتھر کے پاس تیشہ بکف کون آ گیا

غزل

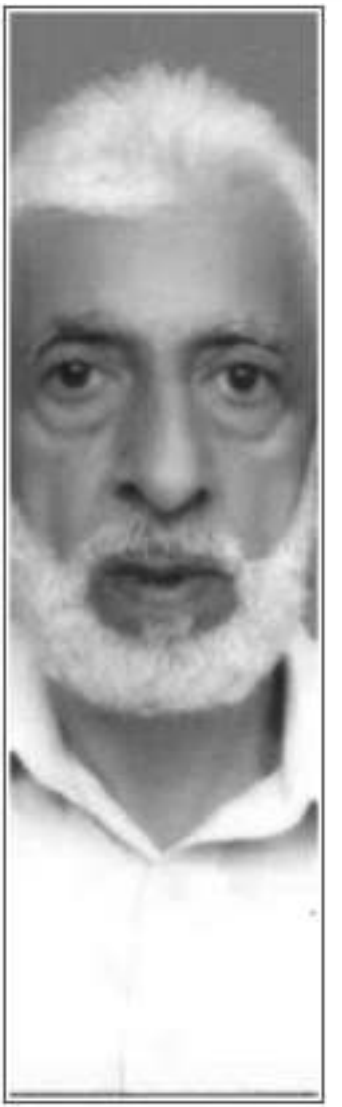

جو تھا ناممکن اُسے ممکن بنانا پڑ گیا
پیڑ پل بھر میں ہرا کر کے دکھانا پڑ گیا

ہجر کی لذّت سے ہونا چاہتے تھے روشناس
ہجر کی یوں آگ کو پھر سے تپانا پڑ گیا

تھا ہمیں شوقِ جنوں اور تھی وفائے رسم بھی
سو نئے ہر زخم پر بھی مسکرانا پڑ گیا

میں کھڑا تھا لمحوں کی دوری سے شاید اس لیے
مجھ کو خود تک پہنچنے میں اک زمانہ پڑ گیا

بے حسوں کا شہر تھا، سو ایک بوڑھے شخص کو
کوڑے داں سے نان کا ٹکڑا اُٹھانا پڑ گیا

بن گیا تھا میری مجبوری جسے کل چھوڑنا
آج پھر سے اُس گلی کی سمت جانا پڑ گیا

کوئی تو تعبیر تک شاہد ہمیں لے جائے گا
خواب اپنا ہر کسی کو یُوں سُنانا پڑ گیا

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

کو بہ کو، قریہ بہ قریہ کیوں پھراتی ہے مجھے
خشک پتوں کی طرح دنیا اڑاتی ہے مجھے

کیا مجھے، مجھ سے زیادہ جانتا ہے آئنہ
کس لئے خلقِ خدا شیشہ دکھاتی ہے مجھے

محفلوں میں بے تحاشا بولتا تھا میں کبھی
اب نکمی گفتگو سے شرم آتی ہے مجھے

ایک لڑکی نے در و دیوار میرے ڈھا دیے
ایک لڑکی ہے جو اپنے گھر بلاتی ہے مجھے

میں نجومی تو نہیں ہوں، جوتشی بھی میں نہیں
یار بستی ہاتھ کا ہے کو دکھاتی ہے مجھے

نام بھی رہتا نہیں ہے ذہن میں جانِ جہاں
شکل تو اکثر تمہاری بھول جاتی ہے مجھے

مہ وشوں سے ہے مری انصر پرانی دوستی
مہ وشوں سے بات کرنی خوب آتی ہے مجھے

انصر حسن

غزل

جس ایک شخص سے دل کے معاملات بنے
وہ مسکرا کے اگر دیکھ لے تو بات بنے

وہ ایک نام ہے ایسا تمام ناموں میں
وہ ایک نام پکاروں، جمالیات بنے

جب اس نے آنکھ جھکائی تو تھم گئی دنیا
جب اس نے آنکھ اٹھائی تو واقعات بنے

بس اِک خلا تھا، خلائے بسیط و بے پروا
سکوت ٹوٹ کے بکھرا، مکالمات بنے

پڑے ہوئے تھے ترے غم کو اوڑھ کر آنسو
سو آج آنکھ سے نکلے نوادرات بنے

وصال و ہجر برابر ہیں اہلِ دل کو میاں!
خوشی و غم تو ازل سے ہیں ساتھ ساتھ بنے

خدا و خلقِ خدا کا کرم ہے نازش پر
کہ اس کے شعر مثال و محاورات بنے

شبیر نازش

غزلیں

نیند کو روگ سا لگا ہوا ہے
خواب دہلیز پر کھڑا ہوا ہے

مجھ کو جینا ہے تیرے بعد بھی سو
میں نے اک دائرہ چنا ہوا ہے

چلتے سکے کا ایک رخ ہے تو
اک مری جیب میں پڑا ہوا ہے

ہم سے چنوائی جو گئی ہے ہمیں
اسی دیوار میں چنا ہوا ہے

اس کا دریا کے پار کوئی نہیں
بس ترے واسطے کھڑا ہوا ہے

اوصاف شیخ

کبھی بھی مجھ سے وہ ہارا نہیں ہے
وہ میرا ہے مگر سارا نہیں ہے

کہا میں نے مرے جیسا بنا دو
کہا اس نے نہیں گارا نہیں ہے

ہوا جو ہو گیا آواز مت دو
ہوا جو اس کا کفارہ نہیں ہے

بسا رکھا ہے تیرا ہجر دل میں
ابھی دیوار پر مارا نہیں ہے

تجھے میں اس لیے بھی چاہتا ہوں
بجز اس کے کوئی چارہ نہیں ہے

غزل

یہ آگہی کا بھی عالم عجیب عالم ہے
لبوں پہ نورِ تبسم تو آنکھ پُرنم ہے

گزر نہ بے خبری میں جہانِ فانی سے
یہیں بہشت ہے تیری یہیں جہنم ہے

سمجھ سکے گا وہی یہ معمہ ہستی
جو دل بھی عظمتِ انسانیت کا محرم ہے

میں فاقہ مست ہوں کیوں ہو غمِ اجل مجھ کو
مرے لیے یہ غم زندگی ہی کیا کم ہے

دکھائی کچھ نہ دیا سایوں کے سوا محسن
ہمارے شعلۂ الفت کی لَو جو مدھم ہے

میتھیو محسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

واضح تھا لفظ لفظ عبارت پڑھے بغیر
اک سُرخ داستاں تھی ، سیہ حاشیہ نہ تھا

غزل

جب سے ہو گیا تنہا چاند
خود سے لپٹ کر رویا چاند

رات فلک کے بستر پر
چاندنی اوڑھ کے سویا چاند

کس کے ایک اشارے پر؟
سورج پلٹا ، ٹوٹا چاند

بڑھتا ، گھٹتا رہتا ہے
دل کا درد اور عرش کا چاند

بھول نہیں سکتا کوئی
پہلا پیار اور پہلا چاند

اِک دن آیا وہ نزدیک
جی بھر کر پھر دیکھا چاند

آئینے میں عکس ترا
جیسے جھیل میں اُترا چاند

ہر اک کا اپنا محبوب
ہر اک کا ہے اپنا چاند

زلفیں اس کی کالی رات
آنکھیں سورج ، ماتھا چاند

پھر جُڑتا ہے مشکل سے
ٹوٹا دل اور ٹوٹا چاند

کھڑکی پر دستک دے کر
چاند بھی دیکھے میرا چاند

ڈھونڈ رہا ہے پھر تجھ کو
تیری دید کا پیاسا چاند

سانس اَٹی ہے نیزے کی
جب سے عقیل کا روٹھا چاند

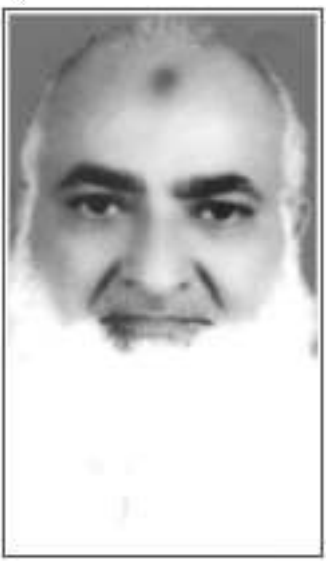

عقیل رحمانی

غزلیں

یہ جان کر بھی اسے کیوں بھلا سنوارا نہیں
ہے ایک بار فقط زندگی دوبارہ نہیں

بس ایک دھن تھی جو لے آئے دشت کی جانب
سفر سے پہلے کیا ہم نے استخارہ نہیں

مجھے رکھا ہے کھلے پانیوں میں اس نے سدا
وہ جانتا ہے کہ میری طلب کنارہ نہیں

ہم اپنے دل کی قیادت میں چلتے جائیں گے
ہمارا راہنما اب کوئی بھی ستارہ نہیں

اسی طرح مرے دن رات کیا بسر ہوں گے
خرابۂ دل و جاں تیرا کوئی چارہ نہیں

وہ اک ہجوم تھا جس میں گھرے رہے ہم لوگ
ہمیں یہ کب تھی خبر کوئی بھی ہمارا نہیں

اسے سمجھتے نہیں شعر ہم کبھی واصف
جو اپنے عہد کا مضبوط استعارہ نہیں

واصف سجاد

شعر کیا تم کو سنائی دیں گے
اب مرے خواب دہائی دیں گے

جرم کرتے ہیں سبھی اپنے قبول
ہم نہیں کوئی صفائی دیں گے

جن جزیروں کی مہک آتی ہے
جانے کس روز دکھائی دیں گے

قید میں کوئی نہ دیکھا جائے
سب پرندوں کو رہائی دیں گے

رنج کب ہوں گے جہاں سے رخصت
درد کب لطفِ جدائی دیں گے

غزل

مرضی ہے آپ کی تو بھلے کچھ بھی کیجئے
ورنہ حضور خود کو تو دھوکہ نہ دیجیے

دل میں بسے ہوؤں کا اگر تو خیال ہو
لازم ہے دھڑکنوں کو بکھرنے نہ دیجیے

چھاؤں کا ساتھ دھوپ میں ملتا رہے گا پھر
پہلے وفا کے بیج تو دھرتی میں بیجئے

اپنے حساب سے تو جو ممکن ہوا کیا
پھر بھی نہیں ہیں خوش تو مری جان لیجئے

دنیا بھی ہنس رہی ہے تماشا گری پہ اب
کچھ تو خیال اپنے مناصب کا کیجئے

کس کو پڑی ہے آ کے کرے پرسشِ ستم
سی کر لبوں کو اپنے سبھی اشک پیجئے

اویس الحسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خود اُلجھتا ہوں ، خود سلجھتا ہوں
کچھ نکھر جاؤں ، کچھ سنور جاؤں

شوگر کے بعد

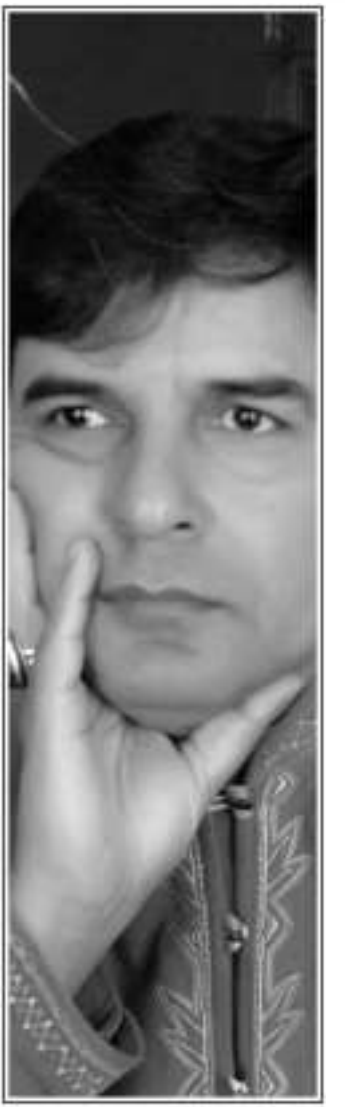

روکھی پھیکی ہوگئی ہے زندگی شوگر کے بعد
ہے بنانا ہر گھڑی کو نقرئی ، شوگر کے بعد

تلخیاں سب زیست کی بھولوں ، معالج نے کہا
خود میں خوش رہنا بھی سیکھوں ہر گھڑی ، شوگر کے بعد

تن کی مجبوری سے شکر چھوڑ دی میں نے مگر
ہے بنالی من میں تیری چاشنی شوگر کے بعد

دل یہ کہتا ہے زیابیٹس کو گولی مار دو
دل میں بڑھتی جا رہی ہے دلبری ، شوگر کے بعد

عشق سے بڑھ کر کہاں ہے جان لیوا یہ وبا
سوچ کر ڈھارس ملی ہے واقعی ، شوگر کے بعد

فاسٹن میں الفت و چاہت ہوئی میری رپورٹ
اور رینڈم مین نظر آئی کمی شوگر کے بعد

اس نے دیکھا میٹھی نظروں سے انیس احمد مجھے
نارمل تھی ، آٹھ سو اسی ہوئی شوگر کے بعد

انیس احمد

غزل

بہت سے مارے گئے ہیں سفر ضروری ہے
پرندے سوچ رہے ہیں سفر ضروری ہے

یہاں تو تیر و تبر ہی کی بات چلتی ہے
زباں پہ نیزے گڑے ہیں سفر ضروری ہے

شعور و آگہی کی روشنی ہے ممنوعہ
چراغ اوندھے پڑے ہیں سفر ضروری ہے

بگولے باندھ کے رکھے ہوئے ہیں پاؤں میں
یہ رستے غم سے اٹے ہیں سفر ضروری ہے

زباں پہ خار اگے ہیں تو پاؤں میں چھالے
مگر چلے تھے چلے ہیں سفر ضروری ہے

رضا مذاق اڑایا گیا مگر اب کے
سبھی یہ مان گئے ہیں سفر ضروری ہے

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زُلفیں کھول کے رنجوری کی
کس نے دُکھوں کی مشہوری کی

غزل

کہاں کہاں سے گزر آئی میری بے خبری
یہ کس کے دھیان میں مُسکائی میری بے خبری

بتوں کے شہر میں اِک عشق بھی غنیمت تھا
وفا کا بوجھ اُٹھا لائی میری بے خبری

کوئی خیال تھا، رستہ تھا یا پڑاؤ تھا
کبھی نہ لَوٹ کے گھر آئی میری بے خبری

بہت دِنوں میں رہی ہوں کسی کھنڈر کے بیچ
کہانیوں سے نِکل آئی میری بے خبری

اب اس دیار میں رہنا نہیں رہا ممکن
یہ کس خبر کی خبر لائی میری بے خبری

کسی سے آنکھ ملا کر سوال کیا کرتے
نظر بچا کے گزر آئی میری بے خبری

فرحت زاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم پجاری بھی ہیں خالد فقط آزر تو نہیں
بُت تراشے ہیں، خدا مانا ہے خود پُوجے ہیں

غزل

سعدیہ بشیر

ہاتھوں میں دل کے آ گئے قیدی دماغ کے
تاروں کے رقص میں نہیں منظر صباغ کے

قائل نہ کر سکے تھے وہ اجلے فریب سے
ہم رنگ گھولتے رہے، دائی وہ داغ کے

معذور اس قدر تھے کہ بس گنگ رہ گئے
جلتے ہوئے سوال تھے بجھتے چراغ کے

ایسا تھا پہلو دار وہ خطبہ خطیب کا
منصف کے ہاتھ سے گرے پتھر سراغ کے

اس چشم نم سے خواب کی تعبیر کب کھلی
صوفی کے ہاں بھی بجھ گئے صدے ایاغ کے

بادِ صبا کے ہاتھ میں بس نارسائی تھی
کیسی ہوا کے دوش پہ ہیں تخت باغ کے

بیٹھیں تو ساری زندگی یونہی گزار دیں
سوچیں تو ہاتھ سے گریں لمحے فراغ کے

پرکار میں تو دائرہ تھا، زاویہ نہ تھا
رستے نہیں کھلے تھے ابھی انفراغ کے

غزل

زمیں سے ہوتا ہوا آسمان پر آیا
میں پھر پھرا کے زمانے کے بعد گھر آیا

تڑپ رہی تھیں کئی کشتیاں کناروں پر
میں اپنی آنکھ سے دریا کا پیٹ بھر آیا

میں اس خیال کو اپنا کہوں تو کیسے کہوں
خیال یہ جو مجھے اس کو دیکھ کر آیا

دنوں کے بعد وہ قوس قزح کے رنگ کھلے
دنوں کے بعد کہیں آسماں نظر آیا

کھڑے ملے تھے ہزاروں مکان رستے میں
پھر ان کے بعد کہیں جا کے اک شجر آیا

پھر اس جہان میں وہ سب جواب دینا پڑا
میں اس جہان میں کیا کیا نہ دیکھ کر آیا

میں پہلی بار ملا موت کے فرشتے سے
تو بار بار مجھے زندگی سے ڈر آیا

طویل دشتِ مسافت نے میرا ساتھ دیا
سفر تمام ہوا تو وہ ہم سفر آیا

مسعود احمد

غزل

دیا جلانے کا جب سے ہنر ہے آیا مجھے
تو پھر ہواؤں نے آ کر نہیں ڈرایا مجھے

میں جلتی دھوپ میں آیا تو کچھ سکون ملا
سلگتی چھاؤں نے برسوں تلک جلایا مجھے

میں کس نگر میں ہوں منظر ہیں اجنبی سارے
کہ آج گھر بھی لگا ہے بہت پرایا مجھے

وہ میری یادوں کو پھر بھی شکست دے نہ سکا
میں جانتا ہوں کہ اس نے بہت بھلایا مجھے

دہکتے دشت میں ترسا ہوں کتنا چھاؤں کو
کہ جلتی دھوپ میں سورج لگا تھا سایا مجھے

میں جانتا ہوں بھرم اس سے رنگ و نور کا ہے
عنایتیں ہیں یہ اس کی کہ جگمگایا مجھے

میں جیت جاتا تو خفت سے منہ چھپاتا کہاں
ہزار شکر کہ اس نے ہے پھر ہرایا مجھے

جلیل میرا وہاں ڈوبنا ہی بنتا تھا
وہ کس خلوص سے گرداب میں تھالایا مجھے

احمد جلیل

غزل

اسی سے مانگیے اور گڑگڑائیے صاحب
یہ کام کیجئے اور پھر بتائیے صاحب

ہم آ کے طور پہ بیٹھے ہیں کچھ کرم کیجے
جھلک ہمیں بھی کسی دن دکھائیے صاحب

کہا ہے اس نے تو سمجھو کہانی ختم ہوئی
کہا ہے اس نے تو کشتی بنائیے صاحب

پھر اس کے بعد ذرا دیکھیے بچا ہے کوئی
ذرا سی دیر کو بتی بجھائیے صاحب

یہ اب کی بار بھی مجھ کو نہیں جلائے گی
میں منتظر ہوں چتا کو جلائیے صاحب

مجھے یقیں ہے کہ مچھلی اگلنے والی ہے
مجھے بچائیے، بیلیں اگائیے صاحب

جو سکہ شہر میں چلتا تھا وہ بدل بھی چکا
انہیں بتائیے ان کو جگائیے صاحب

مجھے یقیں ہے کہ پانی نہ راہ روکے گا
عصا اٹھائیے رستہ بنائیے صاحب

اگر نماز ہی معراج ہے مری تو پھر
یہ درمیان کے پردے اٹھائیے صاحب

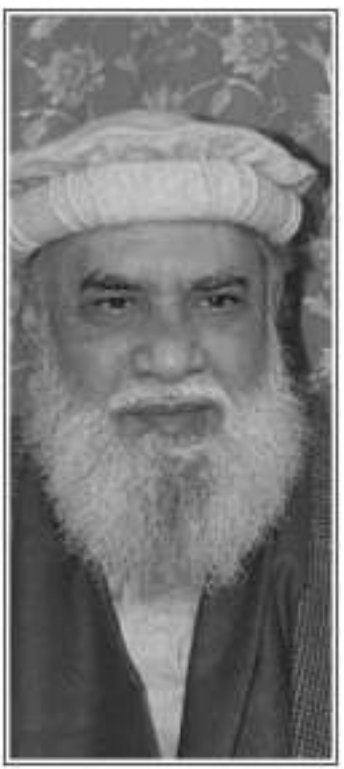

اکرم ناصر

غزل

لایا ہُوں ایسے ڈھونڈ کے مَیں قافیہ ردیف
دانتوں میں اُنگلی داب کے بیٹھے ہیں سب حریف

یُوں لڑکھڑائیں شعر کے مصرع اِدھر اُدھر
لگتا ہے ہو گئے بڑے الفاظ بھی نحیف

تُو سہلِ ممتنع کے سُناتا ہے گرچہ شعر
ہر بار تیری بحر بھی ہوتی ہے بس خفیف

اِک دوسرے کو مان کے ہوتا ہے فائدہ
تسلیم کر لیا تجھے ، تُو بھی تُو بن حلیف

ہر پیٹ میں پڑا ہے ملاوٹ بھرا اناج
اکثر ہی بدمعاش ہیں، کم کم ہیں اب شریف

بیٹوں کو جو بڑھاپے کا سمجھتے تھے آسرا
سڑکوں پہ ڈھول بھانگنے بیٹھے ہیں وہ ضعیف

دیکھا ہے آفتاب کو ہر دن ہی ضوفشاں
چاہے وہ ہو ربیع کہ ہو موسمِ خریف

آفتاب خان

غزل

جیسے دریا کے کنارے کوئی پیاسا ٹھہرا
میں ترے شہر میں رہتے ہوئے تنہا ٹھہرا

میں کنارے پہ کھڑے خشک درختوں میں سے ہوں
اور تو ہے کہ جو بہتا ہوا دریا ٹھہرا

وہ کہاں میری محبت کو سمجھ سکتا ہے
میں تو خود اپنے لیے ایک معما ٹھہرا

وہ نئے وقت کی رکھتا ہے چمک آنکھوں میں
میں تو اس کے لیے گزرا ہوا لمحہ ٹھہرا

تم کو خوشبو نے جو دیکھا تو خوشی سے جھومی
تم جہاں ٹھہرے وہیں جھونکا ہوا کا ٹھہرا

تم جو اٹھو تو بگولوں کی طرح اٹھتے ہو
تم جہاں ٹھہرے وہیں گھوم کے رستا ٹھہرا

توڑ دیتے ہیں جسے کھیل کے سب لوگ کمال
میں وہ انساں ہوں جو مٹی کا کھلونا ٹھہرا

محمد اشرف کمال

غزل

جو ہوا شمعِ سحر پر اب ہے بَرہم
وہ شناسا تھی اُسی کی لُو سے باہم

اک دیے کا حبسِ بے جا میں گھٹا دم
اب بچھائے گا دھواں بھی فرشِ ماتم

وصل کی جس شب میں راحت بھی تھی میسر
تھا اسی شب ہر طرف اِک ہُو کا عالم

منتظر تھا میں درِ مطلع پہ ان کا
وہ مقطع پر ہی مل لیتے کم از کم

جان ہے کچھ جن میں وہ لے آؤ مصرعے
جو ابھر آئے کتابوں میں سے یکدم

دَم سے آیا تھا نہ دَم میں دَم اے ہمدم
دَم ہی نے کیا ایسا میرے ناک میں دم

چاہتے ہیں وہ تجھے پرکھیں بھی احمد
تو لغت کردار کی رکھ پاس ہر دم

علی رضا احمد

غزل

ڈھونڈ وہ دن جب یہاں شام و سحر تھی زندگی
اس قدر مصروفیت سے بے خبر تھی زندگی

اہمیت انسان کی سب سے مقدم تھی یہاں
اس لئے ہر موڑ پر ہی معتبر تھی زندگی

اب ہمیں سب کچھ میسر ہے یہاں اس کے بغیر
کچھ نہیں تھا پاس اپنے ہاں مگر تھی زندگی

خون کے سائے ہیں رقصاں جس طرف بھی جایئے
کب انہی گلیوں میں پہلے پر خطر تھی زندگی

اب مرے حصے میں بس حد نظر تک دھوپ ہے
میرے سر پر باپ کے ہوتے شجر تھی زندگی

یونہی اٹھ کر آ گئے محفل سے ہم تو افتخار
سچ اگر پوچھے کوئی تو اپنے گھر تھی زندگی

افتخار شوکت

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس نے آنکھیں بھر دیں خالد
کس نے دھول میں پھول کھلایا

غزل

کرب چہرے پہ نمودار نہیں بھی ہوتے
شاخِ گُل پر تو کہیں خار، نہیں بھی ہوتے

ہر ترازو میں وفا کو نہیں تولا جاتا
سب محبت کے طلبگار نہیں بھی ہوتے

یاالٰہی تُو مجھے ان سے بچا کر رکھنا
یار ہوتے ہیں مگر یار نہیں بھی ہوتے

روشنی ان کی بھی راہوں میں بچھی رہتی ہے
جو چراغوں کے طرف دار نہیں بھی ہوتے

در پہ آئے ہوئے سائل کا بھرم توڑتے ہو؟
چھوڑو تکرار کہ حق دار نہیں بھی ہوتے

اپنی پاکٹ میں کہیں ہم کو پڑا رہنے دے
کھوٹے سکے کبھی بیکار نہیں بھی ہوتے

تختِ بلقیس اٹھا لانے کا دعویٰ تو کرو
جانتے ہیں کہ چمتکار نہیں بھی ہوتے

اُس کے کوچے میں قدم پھونک کے رکھنا ارشد
دیکھ دشمن یہ طرح دار نہیں بھی ہوتے

ارشد محمود ارشد

غزل

نہ ہم اتنے لاچار ، مجبور ہوتے
اگر دنیا بھر میں نہ مشہور ہوتے

یہی مان لو ، وقت کا فیصلہ ہے
کہ ہر اک کو ہی پھر تو منظور ہوتے

نہیں کوئی بھی بات ڈرنے کی ہوتی
اگر آپ ایسے نہ مخمور ہوتے

میں رکھتا تمھیں بانہوں میں رات دن ہی
اگر گھر مرے سے نہ تُم دور ہوتے

خوشی سے نہیں کوئی ملتا کسی کو
سبھی لوگ ہی کاش مسرور ہوتے

ترے دل کی دھڑکن مرے دل میں ہوتی
دِلوں کے نہیں شیشے پھر چور ہوتے

نہ برباد فاروقؔ جی اشک کرتے
جو تُو ہنس کے ملتا ، نہ رنجور ہوتے

زبیر فاروق

غزل

میری مانو ، پتھر ہے
موم نہ سمجھو پتھر ہے

میرا کہنا جھوٹا تھا
اب کہتے ہو پتھر ہے

تیرے دل کو روگ لگا!
تیرا دل تو پتھر ہے

اٹھتا ہے تو نام دھواں
جم جائے تو پتھر ہے

ایسی کیا افتاد پڑی
جس کو دیکھو پتھر ہے

ہر چہرے پہ آج عزیز
چہرہ ہے ، سو پتھر ہے

عزیز عادل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جاگ رہا ہے تُو مجھ میں
یا ، تیری خو بو مجھ میں

غزل

کب بناوٹ مری سہہ سکا آئنہ
دیکھتے ہی خفا ہو گیا آئنہ

میں تو ہوں دیکھتا آئنے کی طرف
میری جانب نہیں دیکھتا آئنہ

پتھروں کا نگر پتھروں کے بشر
آخری بار سچ بولتا آئنہ

ریت کی ایک دیوار پیشِ نظر
چال اُلٹی سی چلنے لگا آئنہ

عکس آنکھوں کے دم توڑ جائیں گے سب
دیکھ دستِ قضا! مت دکھا آئنہ

گر نہ اب بھی کھلے آنکھ، افسوس ہے
ڈھل چکا راستہ، جُڑ چکا آئنہ

اُس کو میرے سوا بھی کوئی دیکھ لے
اِتنی سی بات پر جل بجھا آئنہ

ایک منظر مگر ان گنت زاویے
وقت کے ہاتھ میں گھومتا آئنہ

پھول کی خوبصورت پھبن دیکھ کر
کاش بن جائے بادِ صبا آئنہ

یارِ جانی کا توبہ شکن وہ بدن
اور ایماں بچاتا ہوا آئنہ

جامہ زیبی کا صبر آزما مرحلہ
بس کہ آنکھیں چراتا رہا آئنہ

سامنا کیسے فیضانؔ کر پاؤں گا
معصیت کوش میں، پارسا آئنہ

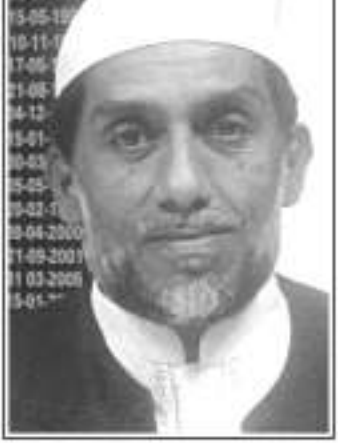

فیض رسول فیضان

غزل

میل کے پتھر پر اپنی آنکھوں کو دھرنا بھول گیا
تو نے مجھے رفتار ہی وہ دی ہے کہ ٹھہرنا بھول گیا

اسی لئے کہتا ہوں اونچی پروازوں سے باز آؤ
جو بھی امبر پر جا پہنچا نیچے اترنا بھول گیا

آج ہی میں افلاک کی وادی میں اس کو آؤں گا نظر
وہ غلطی سے میرے پروں کو آج کترنا بھول گیا

میں نے اس کی عصمت کو محصور کیا محفوظ کیا
میرے ہاتھوں میں آ کر اک پھول بکھرنا بھول گیا

ایسا نہیں بس مجھ کو ہی اب اس کی محبت یاد نہیں
وہ بھی اب اے یار گلی سے میری گزرنا بھول گیا

اس کی سانسیں لحہ لحہ زندگی پاتی جاتی ہیں
تجھ کو دیکھ کے مرنے والا جیسے مرنا بھول گیا

میرے بھی دل میں اب اس کو پانے کی حسرت بچی نہیں
وہ بھی میری خاطر شاید آہیں بھرنا بھول گیا

میں نے بسا رکھا ہے اس کو اپنی آنکھوں کے اندر
آئینے کے آگے اب وہ پہروں سنورنا بھول گیا

اس پر میرے پیار کا ایسا جادو چلا ہے کیا کہیے
اب وہ اپنے وعدے سے بھی یار مکرنا بھول گیا

ذکی طارق

غزل

حیات بھر کی ضرورت ہے اور کچھ بھی نہیں
کہ مجھ کو تجھ سے محبت ہے اور کچھ بھی نہیں

نہیں نہیں میں نہیں ہوں مریضِ بے خوابی
ترے خیال کی عادت ہے اور کچھ بھی نہیں

تسلی دل کو میں دیتا ہوں تجھ سے مِلتے ہوئے
یہ چند پل کی رفاقت ہے اور کچھ بھی نہیں

پگھلتا جاتا ہے جو مِثلِ شمع دل میرا
یہ تیری دید کی حِدّت ہے اور کچھ بھی نہیں

تری جدائی کے لمحے بیان کیا میں کروں؟
کہ مجھ پہ گزری قیامت ہے اور کچھ بھی نہیں

یہ بات کرتے ہُوئے تیرا مُسکرا دینا
ذرا سی دل ہی کو راحت ہے اور کچھ بھی نہیں

تجھے مِلا ہوں تو لگتا ہے مِل نہیں پایا
مجھے یہ ایک ندامت ہے اور کچھ بھی نہیں

قلم بھی پاس ہے کاغذ بھی میز، کُرسی بھی
نئے خیال کی حاجت ہے اور کچھ بھی نہیں

خموش بیٹھا ہے کمرے میں آج پھر کیفی
جدھر بھی دیکھیے خلوت ہے اور کچھ بھی نہیں

محمود کیفی

غزل

دن کے سفید رنگ پر ایسی چڑھی ہے غم کی شام
پہلے بھی دیکھی بار ہا، اب تو نئی ہے غم کی شام

جالوں بھری ہیں کھڑکیاں، تازہ ہوا نہ کوئی شور
گھر کی اُداسی دیکھ کر رونے لگی ہے غم کی شام

دل میں کوئی سوال ہے اور نہ آنکھیں منتظر
بدلے ہوئے سے لوگ ہیں، بدلی ہوئی ہے غم کی شام

میں نے کہا کہ پھول ہیں شاخوں سے جھانکتے ہوئے
دل نے کہا! نہیں نہیں، ٹھہرو ! ابھی ہے غم کی شام

بدلا نہ آسمان پر جاتے ہوئے سمے کا رنگ
کتنے برس گزر گئے اب بھی وہی ہے غم کی شام

میرے وجود میں ظہور گونج تھی اک سکوت کی
پوچھ نہ اُس کے ہجر میں کیسے تھمی ہے غم کی شام

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سیلِ سبک سیر! سبک سَر نہ ہو
سَطوتِ فن ، نام نہیں ، ننگ ہے

غزل

مجھ کو زمیں پہ ڈھونڈ نہ ہی آسمان میں
تجھ کو ملوں گا میں ترے وہم و گمان میں

جیسے کہ اس میں ہو کسی آسیب کا اثر
رہتا نہیں ہے اب کوئی دل کے مکان میں

اتنا حسین روپ ہے اس برف زاد کا
جیسے کِھلا ہو پھول کوئی پھول دان میں

میرا وجود دھوپ میں تحلیل ہو چکا
سایہ مگر پڑا ہے ابھی سائبان میں

رستوں سے جھانکتی ہیں شبِ غم کی گردشیں
پر خوف چھا گیا ہے کوئی کاروان میں

میں بن گیا ہوں قیس کے مسلک کا معتقد
مشہور ہے یہ بات مرے خاندان میں

اک تو ہے جس کی آس پہ ہے زندگی سے ربط
ورنہ تو کچھ نہیں ہے ترے بن جہان میں

ساحل ذرا سنوار دے آ کر یہ خد و خال
بکھرا پڑا ہوں کب سے میں اس خاکدان میں

ارسلان ساحل

غزل

جسے کھا گئی مری خامشی وہی قہقہہ نہیں مل رہا
کبھی گفتگو تھی کمال کی مگر اب سرا نہیں مل رہا

کبھی پھوٹتی تھی شگفتگی رگِ جان و دل پہ چٹک چٹک
وہ ہوا چلی ہے کہ پیڑ پر کہیں کچھ ہرا نہیں مل رہا

مری زندگی کے وہ باب سب جہاں درج تھے مرے خواب سب
جہاں خواہشیں تھیں ورق ورق وہ کتابچہ نہیں مل رہا

میں الاؤ ہوں کسی راہ کا جسے پھونک کر سبھی چل دیے
جسے بانٹتا تھا میں روشنی وہی قافلہ نہیں مل رہا

نہیں کھل سکے کسی آنکھ پر ترے خال و خد کے وہ زاویے
مرے بعد پھر ترے عشق میں کوئی مبتلا نہیں مل رہا

کہیں دیویاں کھڑی راہ میں کہیں گوپیاں ہیں اِدھر اُدھر
مری رادھکا ترے کرشن کو ابھی راستہ نہیں مل رہا

کہیں دلربا کہیں کافرہ کہیں نازنیں کہیں دلنشیں
یہاں اک سے بڑھ کے ہے اک حسیں مگر آپ سا نہیں مل رہا

عاطف جاوید عاطف

غزلیں

ڈھونڈتے ڈھونڈتے اک منزلِ موہوم کی سمت
کیا خبر کل کو رواں قافلے ہونے لگ جائیں

کیا عدم سے بھی ہمیں جانا ہے معدوم کی سمت
چالبازوں کو پسند آئی ہے معصوم کی سمت

فیض یاب ایسے ہی محروم کی جانب دیکھیں
جاری رہتا ہے بہر طور سفر زندگی کا

جیسے حاکم کی نظر اٹھتی ہے محکوم کی سمت
غیر معلوم کی جانب کبھی معلوم کی سمت

یہی ترتیب ہے ترجیح مری شاعری میں
نثر کی راہ سے میں آیا ہوں منظوم کی سمت

اکرم جاذب

یہ سوچیے کہ دل میں کوئی دھن نہیں بھرا
دل میں بسانی چاہیں جہاں بھر کی رونقیں

میں لٹ گیا اور آپ کا آنگن نہیں بھرا
جذبات کے بغیر یہ مسکن نہیں بھرا

کیا خاک بانٹنی ہیں جہاں میں محبتیں!
موسم بہار کا بھی کسی کا ہے منتظر

تجھ سے تو ایک دل کا نشیمن نہیں بھرا
پھولوں کے ساتھ دامنِ گلشن نہیں بھرا

اثبات میں جواب ہو، میں ہاتھ کاٹ لوں
سچ سچ بتا کہ کیا ترا دامن نہیں بھرا ؟

غزلیں

حادثہ وہ کیا ہوا کچھ خبر نہیں مجھے
قافلہ کدھر گیا کچھ خبر نہیں مجھے

نقش مٹ گئے سبھی ایک نام کے سوا
کون کب کہاں ملا کچھ خبر نہیں مجھے

رات دیر تک کھڑے بارگاہ عشق میں
بولتا کیا رہا کچھ خبر نہیں مجھے

حالتِ سجود میں بھی پکارتا رہا
رد ہوئی ہے کیوں دعا کچھ خبر نہیں مجھے

زندگی گزار دی خوف کے حصار میں
کون سی ہوئی خطا کچھ خبر نہیں مجھے

دیر تک رہی مقابل ہوا چراغ کے
کب چراغ بُجھ گیا کچھ خبر نہیں مجھے

ساتھ ساتھ ہم سکندر رہے مدار میں
کب ہوئے جدا جدا کچھ خبر نہیں مجھے

مرزا سکندر بیگ

بے وفا سے کیا گلہ جو ہو گیا سو ہو گیا
تو بھی اس کو بھول جا جو ہو گیا سو ہو گیا

دشمنی کرتے رہے جو دوستی کی آڑ میں
دے انہیں دل سے دعا جو ہو گیا سو ہو گیا

ایک یا پھر دو گھڑی کی بات ہے یہ زندگی
مت کسی سے ہو خفا جو ہو گیا سو ہو گیا

روٹھ کر جاتے ہوئے اس نے مجھے روکا نہیں
ہو گئے یوں ہم جدا جو ہو گیا سو ہو گیا

چھیڑ مت میرے گناہوں کی کہانی دوستا
کاٹ لی ناحق سزا جو ہو گیا سو ہو گیا

ہر گھڑی ہر پل سکندر سوچنا بے سود ہے
اس طرح ہو گا بھی کیا جو ہو گیا سو ہو گیا

غزلیں

بیٹھنے ہی کو ہے دھواں میرا
آخری کش لگا میاں میرا

پہلے اترا میں گہری کھائی میں
پھر حقیقت بنا گماں میرا

اب میں ہجرت کروں گا دنیا سے
دل نہیں لگ رہا یہاں میرا

آخری وقت یہ خیال آیا
ڈھونڈنا تھا مجھے جہاں میرا

مجھ سے کچھ بھول ہو گئی ہو گی
اس جگہ بھی نہیں نشاں میرا

درد بھی ہو تو مسکراتا ہوں
زخم ہوتا نہیں عیاں میرا

عمران اعوان

جو میری آنکھ میں ٹھہرے نہیں وہ چھوڑ دیے
تمہارے جیسے کئی بت بنا کے توڑ دیے

میں تیز چلنے کا عادی تھا، قافلے میں مجھے
جو لوگ سُست ملے، راستے سے موڑ دیے

خدا نے لمس اتارا، مگر یہاں ہم نے
بدن کے سلسلے تاروں کے ساتھ جوڑ دیے

ہمارے دل کا پرندہ اڑان بھرنے لگا
کسی نے پھر سے پٹاخے ہوا میں پھوڑ دیے

میں جن کے ساتھ کبھی بات کرتا رہتا تھا
مرے حریف نے وہ آئینے بھی توڑ دیے

غزل

دن محبت کے نہ مہکائے یہ قصہ کیا ہے
چاند اُمید کہ گہنائے یہ قصہ کیا ہے

اشک آنکھوں سے مسلسل ہی رواں رہتے ہیں
اِک گھڑی چین نہیں آئے یہ قصہ کیا ہے

کس نے احساسِ ندامت کو سبوتاژ کیا
جُرم پہ کوئی نہ شرمائے یہ قصہ کیا ہے

سبز موسم میں بھی کھلتے نہیں اظہار کے پھول
لب کوئی بھی نہ ہِلا پائے یہ قصہ کیا ہے

جس کے سب رنگ محبت کے ہوں رنگوں جیسے
ہم نہ تصویر بنا پائے یہ قصہ کیا ہے

جھڑنے لگتے ہیں درختوں سے ہرے پات سبھی
ڈھلنے لگتے ہیں گھنے سائے یہ قصہ کیا ہے

عمر بھر جن کی طرف ہاتھ بڑھایا میں نے
وہ مرے ہاتھ نہیں آئے یہ قصہ کیا ہے

ناچنے گانے لگے جتنے بھی تھے عکس تمام
آئنے ٹوٹ کے مُسکائے یہ قصہ کیا ہے

ہنستے گاتے ہوئے اِس بار مرے شہر کے لوگ
زندگی سے بھی ہیں اُکتائے یہ قصہ کیا ہے

چاپ قدموں کی سُنے جاتے ہیں ہم بھی لیکن
سانپ، سائے سے لپٹ جائے یہ قصہ کیا ہے

لوگ کہتے ہیں محبت کا امیں جس کو نبیل
جسم، دیوار میں چُنوائے یہ قصہ کیا ہے

نبیل احمد نبیل

غزلیں

بھڑکا ہُوا تھا شعلہ مگر سرد ہو گیا
مجھ سے بچھڑ گیا تو وہ بے درد ہو گیا

توڑا ہے ربط تُو نے، یہ احسان ہے ترا
اک عشق مر رہا تھا کہ پامرد ہو گیا

ایسی نمی تھی آنکھ میں رستہ نہ مل سکا
گزرا ہُوا جو وقت تھا وہ گرد ہو گیا

مایوس ایک لڑکی نے ڈالی جو کل نظر
سر سبز جو شجر تھا وہی زرد ہو گیا

بھڑکی جو دل میں آگ تو جھلسا دیا مجھے
دل پہ گری جو برف تو میں سرد ہو گیا

جبرانؔ اُس کی رائے بھی تبدیل ہو گئی
اب وہ بھی اس سماج کا اک فرد ہو گیا

وسیم جبران

خوشبوؤں سا، روشنی سا، ایک پیکر دیکھنا
نوٹ بک میں تم بھی کوئی نام لکھ کر دیکھنا

جانتے تھے ہم نہیں ملنا نصیبوں میں مگر
پھر بھی اُس کے ہاتھ میں اپنا مقدر دیکھنا

ریل گاڑی جا چکی ہے یہ مجھے معلوم تھا
پھر بھی خالی پٹریوں کے پاس آ کر دیکھنا

شامِ غم، نتھیا گلی اور گرم کافی کی مہک
جنوری میں تم کو تڑپائیں گی اکثر دیکھنا

بھور بن کی بارشیں پھر آنکھ میں آ جائیں گی
تم تصور میں کبھی یادوں کے منظر دیکھنا

آنکھوں آنکھوں میں ہی طے ہوتا تھا گھر تک کا سفر
اور پھر چلتے ہوئے اُس کو برابر دیکھنا

تھامنا جب بھی کبھی جبرانؔ اُس کے ہاتھ کو
میں نے جیسے چاند کی نرمی کو چھو کر دیکھنا

غزلیں

گلِ ماتم کدہ پر گھر اُگے ہیں
عجب گریہ کناں منظر اُگے ہیں

ذرا جلّاد سے کہہ دو کہ آئے
نئے اِس شہر میں کچھ سر اُگے ہیں

مجھے پَرواز کی توفیق دے دے
مرے شانوں پہ تازہ پَر اُگے ہیں

ترے دَورِ قیامت کے کرم سے
دِلوں ، کی دھڑکنوں میں ڈر اُگے ہیں

مرے کھیتوں میں اَب کی بار قائل
کہیں پیکاں کہیں خنجر اُگے ہیں

عمر قیاز قائل

بس اِسی غم نے رُلایا اَب تک
کوئی ملنے نہیں آیا اَب تک

جِس کی خواہش میں زمانہ چھوڑا
وہ بھی ہے دوست پَرایا اَب تک

یُوں تو خُورشید بکف ہیں سارے
کیوں اندھیرا ہے خُدایا اَب تک

کتنا دشوار ہے ہنسنا خُود پر
جشن یہ بھی ہے منایا اَب تک

کاش! مل جائے وہ ہم کو، قائل
جو پلٹ کر نہیں آیا اَب تک

غزل

بے ضمیروں سے محبت نہ کرو
تم خسارے کی تجارت نہ کرو

لوٹ لیتے ہیں جو رہبر بن کر
اُن درندوں سے رعایت نہ کرو

جو مقدر میں نہ لکھی رب نے
ایسی شے کی کبھی حسرت نہ کرو

لوگ سڑکوں پہ نکل آئیں گے
یہ سرِ شام قیامت نہ کرو

ڈال دیں تجھ پہ کرونا نہ کہیں
کھانسنے میں کبھی عجلت نہ کرو

جو فنا ہونا ہے آخر اک دن
ایسی دُنیا سے محبت نہ کرو

خشک پتے تو بکھر جاتے ہیں
تیز جھونکوں کی شکایت نہ کرو

ظلم کو دو نہ بڑھاوا شافی
کبھی ظالم کی حمایت نہ کرو

عقیل شافی

غزل

مری نفرت ترا مسلک بھی تو ہو سکتا ہے
اس کا انجام بھیانک بھی تو ہو سکتا ہے

یہ جو ہر بات پہ تم میری قسم کھاتے ہو
ایسی باتوں سے مجھے شک بھی تو ہو سکتا ہے

ہو بھی سکتا ہے کوئی درد مجھے کل وقتی
پر کوئی رات گئے تک بھی تو ہو سکتا ہے

وقت لگتا ہے کوئی راز عیاں ہونے میں؟
یار! یہ کام اچانک بھی تو ہو سکتا ہے

عین ممکن ہے کوئی باب عطا کھل جائے
میرا سر پھوڑنا دستک بھی تو ہو سکتا ہے

پھر بھی تجھ خواب کو میں ہارا ہوا لگتا ہوں
تیرا ہونا مجھے انتھک بھی تو ہو سکتا ہے

میرا ہر شعر تجھے اپنی کہانی ہی لگا
یہ مری ذات کا اندرک بھی تو ہو سکتا ہے

رمیض نقوی

غزل

سانس میری گھڑی پہ اٹکی تھی
اس نے آنے میں دیر کر دی تھی

آپ نے بھی کسی کو کھویا ہے
ہم سے بھی اک ٹرین چھوٹی تھی

اپنی ناکامیوں پہ غور کیا
تو تعاقب میں کس کی سسکی تھی

چھوڑ آیا ہوں اپنا سایہ بھی
مجھ کو جلدی تھی اور اتنی تھی

ماں نے بوسہ لیا تھا ماتھے کا
جسم کے ساتھ روح مہکی تھی

جانتا تھا مجھے ضرورت ہے
اس لئے تحفے میں گھڑی دی تھی

ذہن کو بھی سکون ملتا تھا
آنکھ بھی فیض یاب ہوتی تھی

خود کو دانستہ بیخبر رکھا
میرے وارے میں خود فریبی تھی

اپنی بیکار زندگی میں بھی
کچھ تو تھا جس کی مجھ کو جلدی تھی

پھر بھی میں گنگنا نہیں پایا
ساز بھی ، من پسند دھن بھی تھی

کل تری یاد تک نہیں آئی
کل کہاں یاد تیری بھٹکی تھی

بس چلانے کی دیر تھی احمد
ہر سو آواز میری گونجی تھی

احمد محسود

غزل

یہ جو تجھ سے مرا لگاؤ ہے
یہ مرا آخری پڑاؤ ہے

عشق اعزاز ہے چھپاؤ نہیں
جو بھی پوچھے اسے بتاؤ ، ہے

وہ ہے تصویر دیکھنے والی
اس میں رنگوں کا جو رچاؤ ہے

مجھ کو دکھتا ہے جو نہیں دیکھا
یار اس سے کوئی بچاؤ ہے؟

دیکھنا ہے صغیر لکھا ہوا
اپنی آنکھیں ذرا دکھاؤ ، ہے؟

صغیر احمد صغیر

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

در بہ در گریہ کناں ، طالب درماں کیوں ہیں؟
تیرے عشاق گرفتارِ غمِ جاں کیوں ہیں؟

غزل

یہی میری جیت ہے نہ آپ کی یہ ہار کی صورت
نہ جانے کس طرح پیدا ہوئی تکرار کی صورت

بجا ہے آپ کی ناراضی یہ تو دیکھیں آپ
میرے انکار میں مضمر ہے اک اقرار کی صورت

خوشی سے بھی تو آنسو چھلک پڑتے ہیں بسا اوقات
چمن میں پھول بھی ہوتا ہے کوئی خار کی صورت

بہت مانگی دعائیں استخارا بھی کیا میں نے
نظر آتی نہیں بنتی کوئی دیدار کی صورت

نہ رستہ بھولتے ہیں اور نہ راہوں میں بھٹکتے ہیں
گھروں کو لوٹتے ہیں جو پرندے ڈار کی صورت

زبان خامشی میں جانے کیا کرتے ہیں یہ باتیں
یہ دیوانے نے کہیں بیٹھیں اگر دو چار کی صورت

نہیں کچھ فائدہ اشفاق لکھنے اور لکھانے کا
اگر اک شعر بھی نہ سن سکے شہکار کی صورت

محمد اشفاق بیگ

غزل

وغا میں کوئی بھی ایسا عدو نہیں آیا
ہماری تیغ پہ جس کا لہو نہیں آیا

یہ مت سمجھ کہ مجھے جاں عزیز ہے اپنی
اگر کبھی تہہِ خنجر گلو نہیں آیا

ہماری پُرسشِ احوال کے لیے اکثر
ترا خیال تو آیا ہے تُو نہیں آیا

وہ ناتواں تھا کہ تیغِ عدو کے چلنے پر
مرے وجود سے باہر لہو نہیں آیا

میں ایسا پیڑ ہوں جس پر بہار ہو کہ خزاں
کسی بھی دور میں بارِ نمو نہیں آیا

وہ نا اُمید ہوا ہوں خدا کے ہوتے ہوئے
مری زبان پہ لاتقنطو نہیں آیا

محاذِ عشق سے ناکام آ گیا لیکن
خدا کا شکر کہ بے آبرو نہیں آیا

کہیں نہ پھر سے اماوس نے گھیر رکھا ہو
جو چاند آج سرِ آب جُو نہیں آیا

ہاں! وہ طبیب تو آیا تھا نیشتر کے لیے
برائے زحمتِ کارِ رفو نہیں آیا

مجھے پتہ ہے محبت ہے کیا ہوس ہے کیا
سو اُس کو دیکھ تو آیا ہوں چھو نہیں آیا

کبھی نہ ہاتھ لگاؤں گا تیر و ترکش کو
اگر نکال کے چشمِ عدو نہیں آیا

میں آ گیا تری بزمِ نشاط میں لیکن
بدل کے شدتِ گریہ کی خو نہیں آیا

وہ عکس مجھ کو مکمل دکھائی دے کیسے
جو آئینے میں کبھی ہو بہو نہیں آیا

ازور شیرازی

غزل

میں نے قسمت کو آزمایا تھا
وہ مری زندگی میں آیا تھا

میں نے اپنا سمجھ لیا تجھ کو
تو جو اپنا نہیں پرایا تھا

اس کے دل میں تھا کوئی پہلے سے
جس کسی سے بھی دل لگایا تھا

ساتھ تیرے رہا جو برسوں سے
میں نہیں تھا وہ میرا سایہ تھا

خواب میں اک خیال تھا شائد
اس نے جیسے گلے لگایا تھا

میرے آنگن میں پھول کھلتے گئے
وہ جو بھولے سے مسکرایا تھا

روشنی میں جو میرے ساتھ رہا
میں تھا، تو تھا، یا میرا سایہ تھا

وہ تصور تھا یا کوئی تصویر
تیرے آنے پہ کون آیا تھا؟

وقت ساکت، مقام بھی ساکت
حسن نے معجزہ دکھایا تھا

راجہ عبدالقیوم

غزل

چوٹ کھا کے ہمیں مسکرانا پڑا
دل کو اس طرح بھی آزمانا پڑا

کچھ غموں کی صعوبت سے دل دَب گیا
کچھ غموں کو ہی دل میں دبانا پڑا

جان لیوا اذیت کی شدت بڑھی
درد سہنا پڑا زخم کھانا پڑا

ہجر کی دھوپ میں جل گیا پیار بھی
جن کو بھولے نہ تھے بھول جانا پڑا

روح کے زخم جو مندمل نہ ہوئے
جشن جھوٹی خوشی کا منانا پڑا

زندگانی کے انفاس گنتے ہوئے
ایک پل اور مجھ کو گنوانا پڑا

خام وجدان کے بے ردا آئنے
منکشف راز جن کا چھپانا پڑا

سمیرا یوسف

غزلیں

ہم نہ پریوں کا نہ حوروں کا دہن مانگتے ہیں
کاسۂ حرف میں توقیرِ سخن مانگتے ہیں

ہم اسیرانِ چمن، امن کی خواہش والے
شہرِ گُل رنگ سے خوشبو کا چلن مانگتے ہیں

ہم نے خیرات میں سورج کو حرارت دی ہے
اب ستارے بھی سویرے کی کرن مانگتے ہیں

ختم ہوتا نہیں یہ مرحلۂ شوق کہیں!
اوج پر لوح و قلم، دار و رسن مانگتے ہیں

ہم کہ دریوزہ گرِ حُسنِ دو عالم ٹھہرے
قبلۂ حُسن سے محرابِ بدن مانگتے ہیں

کتنے خوش ذوق ہیں یہ شہرِ محبت کے مکیں!
دمِ رُخصت ترے آنچل کا کفن مانگتے ہیں

میر و غالب سے شناسا نہیں طاہر جو لوگ
کاسۂ شعر لیے دادِ سخن مانگتے ہیں

دستِ ہنر سے عقدۂ عیبِ ہنر کھلے
لا ساقیا شراب کہ معنی کا در کھلے

قاصد کے ہاتھ خط کے علاوہ کہی جو بات
نامے سے پہلے چاہا کہ وہ نامہ بر کھلے

رخشِ قلم کو پر لگیں، سدرہ کی سیر ہو
وہ اوج دے کہ عرشِ معلّٰی کا در کھلے

جیبِ کفن میں آیۂ تطہیر تھا رقم
گنجِ لحد میں جنّتِ عالی کے در کھلے

طاہر مزاجِ شہر ہے دو بے ہنر کو داد
اب ایسے ناقدیں پہ ترا کیا ہنر کھلے

طاہر یٰسین

غزل

آثار دیکھتا ہوں میں آثار سے الگ
خبریں سنا رہے ہیں جو اخبار سے الگ

یہ انہدام کے کہیں آثار تو نہیں؟
سایہ کھڑا ہے دھوپ میں دیوار سے الگ

یہ انتظار ہے کسی پل کا یا احتیاط
تیار دار بیٹھے ہیں بیمار سے الگ

پہلے تو نیک و بد ہی کی تفریق تھی یہاں
اب ہے گناہ گار، گنہگار سے الگ

میں جان بوجھ کر نہیں گھر سے جدا ہوا
مجھ کو کیا گیا بڑے اصرار سے الگ

مجھ پر کواڑ گھر کے مقفل کیے گئے
رستہ بنا رہا تھا میں دیوار سے الگ

پھر یوں ہوا کہ قافلے والے بچھڑ گئے
رفتار ان کی تھی مری رفتار سے الگ

جھوٹا نہیں تھا، خوف کا مارا ہوا تھا میں
گفتار تھی مری، مرے افکار سے الگ

پانی نے کشتیوں کو فقط راستے دیے
پانی کبھی ہوا نہیں پتوار سے الگ

پھر اس کے بعد اس پہ تصرف نہیں رہا
جب دائرہ ہوا مری پرکار سے الگ

تا حال بیچنے کو مرے پاس کچھ نہیں
بیٹھا ہوا ہوں گرمیٔ بازار سے الگ

علمدار حسین

غزل

لیا ہے تیری محبت سے یہ اثر میں نے
کہ زندگی پہ بھی ڈالی ہے اک نظر میں نے

میں جس خلوص سے نکلا ہوں منزلوں کی طرف
اکیلے کاٹ ہی لینا ہے ہر سفر میں نے

وہ ایک یاد جو سینے میں قید ہے میرے
وہ ایک پل جسے کرنا نہیں بسر میں نے

مسافتوں نے بدن چھلنی کر دیا تھا مرا
اُگا لیا ہے سرِ دشت اک شجر میں نے

نکل پڑی ہے نئے موسموں کی آمد پر
وہ ایک شاخ جو کاٹی تھی دیکھ کر میں نے

میں شور و شر کے سمندر سے آج نکلا ہوں
بچا لیا ہے تری سازشوں سے سر میں نے

بھلے دنوں میں ترا آسرا تھا اے مالک
نڈھال ہو کے بھی چھوڑا نہ تیرا در میں نے

بچھڑ کے تجھ سے توازن بگڑ گیا ہے مرا
کہ لفظ نثر تھا باندھا جسے بحر میں نے

مستحسن جامی

غزل

یہ جو سپنا ہے مقدر بھی تو بن سکتا ہے
ایک تصویر سے منظر بھی تو بن سکتا ہے

یہ ضروری تو نہیں جاں سے گزر کر پہنچوں
مرا مرقد مرے اندر بھی تو بن سکتا ہے

مرے آنسو کو حقارت کی نظر سے مت دیکھ
یہ جو قطرہ ہے سمندر بھی تو بن سکتا ہے

ایک دنیا دلِ ناشاد میں آباد ہوئی
اتنی تنہائی سے لشکر بھی تو بن سکتا ہے

بن کے پتھر وہ مری راہ میں آ بیٹھا ہے
وہ مرے پاؤں کی ٹھوکر بھی تو بن سکتا ہے

کیوں وہ کانٹوں پہ مرا دامنِ خستہ کھینچے
وہ حسیں ، شاخِ صنوبر بھی تو بن سکتا ہے

چاہ و حشمت یہ ہی موقوف نہیں ہے سب کچھ
دل ابابیل کا کنکر بھی تو سکتا ہے

تم کو جس شخص پہ اتنا ہے بھروسہ فیصل
وقت آنے پر ستمگر بھی تو بن سکتا ہے

فیصل زمان چشتی

غزل

یہ بادل بارشیں برسائے ، تب نا
ٹھہرنے کا بہانا لائے ، تب نا

چلی تو جاؤں، لیکن کیسے، بولو!
کوئی رستہ نظر بھی آئے ، تب نا

پہاڑوں میں ہی جی کو میں لگا لوں
کوئی منظر بھی دل کو بھائے ، تب نا

بنوں رانی میں دل کی، خوش دلی سے
وہ تخت و تاج کو ، ٹھکرائے تب نا

وہ آئے، اور کہہ دے جان میری!
مرے بن اس کا دل گھبرائے ، تب نا

میں ایسے کس طرح جینے کا سوچوں
وہ گل کے سامنے آ جائے ، تب نا

کوکی گل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے خدا ، سمت نمائی مری سیرت کر دے
مجھ کو روشن سرِ آفاقِ محبت کر دے

غزل

بشیر احمد حبیب

اک تمنا تھی فاصلے تھے بہت
ایک مرکز تھا ، دائرے تھے بہت

حیطۂ قرب میں تھے کچھ لمحات
دشتِ فرقت میں رتجگے تھے بہت

ایک رستہ ہے، میں سمجھتا رہا
اب جو سوچا تو راستے تھے بہت

کیا عجب تھا وہ کشمکش کا دور
ایک سورج تھا، آئنے تھے بہت

اس کے پہلو میں آ کے ہم پہ کھلا
دشتِ حیرت کے مرحلے تھے بہت

کیا عجب معرکہ بپا تھا حبیب
ایک ملزم تھا ، فیصلے تھے بہت

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہجر کا غم کچھ اور ہے ، آنکھ کا نم کچھ اور شے
زیرِ چراغِ آگہی نورِ ہنر نہیں تو کیا

غزل

ختم شد ذائقے شرینی کے
تلخ تر دن ہیں بے یقینی کے

پوچھتا کون ہم فقیروں کو
سب کو دعوے ہیں شہ نشینی کے

روز و شب ہم گزار آئے ہیں
خود فریبی کے ، خود گزینی کے

چُھٹ گئے طور دلربائی کے
لد گئے دور ناز نینی کے

دیکھ سکتے ہیں جو نہیں دیکھا
یہ کرشمے ہیں دور بینی کے

لوگ سورج کو بھول بیٹھے ہیں
معجزے ہیں یہ مہ جبینی کے

وہ ہیں ہم سے گریز پا اصغر
ہم طلب گار ہم نشینی کے

اصغر علی بلوچ

غزل

یہ کیسی کور چشمی ہے نظر آتا پرایا نم نہیں مرشد
اگرچہ آنکھ کے صحرا میں پانی کی روانی کم نہیں مرشد

دکھائی دے رہا ہے وہ ہمیں جس کی تمنا ہی نہیں شاید
عجب وحشت بپا ہے سامنے ٹیبل پہ جامِ جم نہیں مرشد

ہر اک دھڑکن میں اترا ہے مسافت کی اذیت کا کڑا صدمہ
مجھے زنجیر میں جکڑے کسی رستے میں اتنا دم نہیں مرشد

سوا تیرے، کسی کے کہنے میں آئیں، کسی کو معتبر جانیں
برے ہیں مان لیتے ہیں مگر اتنے برے بھی ہم نہیں مرشد

چراغوں سے الجھنا اور الجھ کر ٹوٹ جانا بھی غنیمت ہے
سہولت کے میسر جب کسی کو بھی یہ پیچ و خم نہیں مرشد

یہی اک وہم ہے ملنے سے پہلے دور ہونے کی قیامت کا
کسی بھی اور پریشانی کا اس دل میں ذرا سا غم نہیں مرشد

ملیحہ سیّد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دشمنِ جاں نفس نفس میرا
دُھول کا پھول ہوں ، کدھر جاؤں

غزلیں

کیا دکھانے اسے غلمان کے اور حور کے خواب
کہاں فردوس کے باسی کہاں مزدور کے خواب

اُس کو خوابوں میں بھی زنجیر نظر آتی ہے
تو نے دیکھے ہی نہیں ہیں کسی مجبور کے خواب

بھوک احساس کی بنیاد ہلا دیتی ہے
پیٹ خالی ہو تو آتے نہیں بھرپور کے خواب

اس کو پرواز کی دنیا میں نہ لے جانا کہیں
صرف بیساکھی تلک ہوتے ہیں معذور کے خواب

رانا غلام محی الدین

محل کی ریت، روایت سے تنگ شہزادی
بڑے سکون سے ہے میرے سنگ شہزادی
تو میری مان کبھی کاخِ خسروی سے اتر
تجھے دکھاؤں خدائی کے رنگ شہزادی
زمینِ دل میں گلِ آرزو تو کھلنے دے
مہک اٹھے گا ترا انگ انگ شہزادی
قدم قدم پہ ملیں گے سو احتیاط رہے
یہاں پہ تجھ کو ہوس کے نہنگ شہزادی
مرا نصیب کہ یک جا ہیں اس قلمرو میں
فرازِ مسندِ دل اور دبنگ شہزادی

مخمصے میں ہوں بجھائی نہیں دیتا کچھ بھی
اک طرف حسنِ بتاں ایک طرف حور کے خواب

اب یہ درویش تری چال میں آنے کا نہیں
ایک تو خواب میاں، وہ بھی بہت دور کے خواب

شکست و فتح نہیں، بات اب بقا کی ہے
سو ہارنے کا نہیں میں یہ جنگ شہزادی
بہت دعائیں مری ہیر تیرے مسکن کو
ہرا بھرا رہے تیرا یہ جھنگ شہزادی
ہمارا عشق ہمیں تخت و تاجِ ہفت اقلیم
ہمارا فقر ہمیں نام و ننگ، شہزادی

غزل

یہیں پہ عکسِ فردشدہ عاشقین میں تھا
وہ آئینہ جو کسی اور سرزمین میں تھا

نمو سے پھوٹ گیا چشمۂ بقا کی طرح
وہ نورِ خاک کے پیکر میں جس جبین میں تھا

سپردگی میں نہیں تھی کہیں پہ ذات اُس کی
مگر وہ شخص کسی ساعتِ یقین میں تھا

بہا دیا کوئی آنسو جو اس نے ہنستے سے
اسی کا رنج چھپا اُس کی آستین میں تھا

الجھ پڑے در و دیوار یار کی صورت
مکاں کا آخری کونا کسی مکین میں تھا

سنا ہے قید ہوا جو زمیں کا وارث تھا
جو شخص قاتلِ دنیا کے شاہدین میں تھا

زاہد خان

---------- انتخاب ----------

- خالد احمد -

نعمان منظور

جسم کے پار کون دیکھے گا!
روح کا بار کون دیکھے گا!

غزل

ڈھونڈ لی تھی گلی گلی میں نے
خود کو دیکھا نہ پھر کبھی میں نے

ان کہی بات بھی کہی میں نے
توڑدی اپنی خامشی میں نے

اک ہی تصویر نقش تھی دل پر
آج وہ بھی اتار دی میں نے

چاند اترا تھا میرے آنگن میں
اوڑھ لی خود پہ چاندنی میں نے

ہر طرف سبز پیڑ تھے، لیکن
زرد پتوں سے بات کی میں نے

یاد آنے لگا ہے ماضی مجھے
ایک تصویر دیکھ لی میں نے

وادیٔ دل سے شور اٹھنے لگا
تری آواز کیا سنی میں نے

وقت سے پہلے تجھ کو سوچ لیا
وقت سے پہلے شام کی میں نے

کیا بتاؤں کہ آئنے کے سوا
خود کو دیکھا نہیں کبھی میں نے

مہر علی

غزلیں

کون سورج کی طرح سامنے آیا ہوا ہے
جو مرے قد کے برابر مرا سایہ ہوا ہے

اب کوئی بوجھ بھی لگتا نہیں بھاری مجھ کو
میں نے بیٹے کے جنازے کو اُٹھایا ہوا ہے

لوٹ آئیں گے کسی روز تمہیں ساتھ لیے
کچھ دعاؤں کے پرندوں کو اڑایا ہوا ہے

تم مرے دوست ہو تم تو کسی سُر میں گاؤ
ورنہ بے ڈھب مجھے دنیا نے بھی گایا ہوا ہے

اکمل حنیف

خود کو جب تولنا پڑا مجھ کو
توڑ کر بیچنا پڑا مجھ کو

میرے پُرکھوں پہ بات آ گئی تھی
بات کو کھولنا پڑا مجھ کو

ڈوب جانا تھا اُس نے ساتھ مرے
ہاتھ وہ چھوڑنا پڑا مجھ کو

اُس کی باتوں کا سحر توڑنا تھا
اس لیے بولنا پڑا مجھ کو

یادِ ماضی عذاب بن چکی تھی
پھر اُسے بھولنا پڑا مجھ کو

ایسے خیرات کی تصویر بنانے والے!
کوئی کاسے میں انا ڈال کے لایا ہوا ہے

باز آتی ہی نہ تھیں خواب ترے دیکھنے سے
میں نے آنکھوں کو اسی ضد میں جگایا ہوا ہے

یہ بھی کہتے ہو تمہیں پیار سے دیکھے اکمل
اور دشمن کو بھی پہلو میں بٹھایا ہوا ہے

لوگ پتھر سمجھ رہے تھے مجھے
اس لیے ٹوٹنا پڑا مجھ کو

سب کو میں منفرد دکھائی دوں
منفرد دیکھنا پڑا مجھ کو

میرا اکمل مرے مقابل تھا
جیت کر ہارنا پڑا مجھ کو

غزل

دیا جلاتے ہوئے روشنی بناتے ہوئے
میں زندگی سے گیا زندگی بناتے ہوئے

پھر ایک خواب کی آہٹ سے نیند جاتی رہی
میں سونے والا ہی تھا خامشی بناتے ہوئے

لباسِ زیست کئی بار تار تار ہوا
بس ایک پیرہنِ کاغذی بناتے ہوئے

وہ جس گلی کو ترا رہ گزار بننا تھا
میں خود کو بھول گیا وہ گلی بناتے ہوئے

نہ پوچھ کیسے ہوئیں انگلیاں فگار اپنی
تمام عمر لگی بانسری بناتے ہوئے

معاف کیجے، یہ تصویر مجھ سے بنتی نہیں
میں آدھا رہ گیا افسردگی بناتے ہوئے

خراب کرتے گئے سب بنا بنایا ہوا
جو بن گیا تھا اسے قیمتی بناتے ہوئے

سید تیمور کاظمی

غزل

اپنوں سے لوگ کٹ کے چلتے ہیں
کتنے حصوں میں بٹ کے چلتے ہیں

سوچا جاتا ہے کم ، یہاں صاحب
جتنے بھی ہیں یہ رَٹ ، کے چلتے ہیں

اتنا پھیلاؤ بھی ، نہیں اچھا
کچھ تو بازو سمٹ ، کے چلتے ہیں

غم لپٹتے ہیں مجھ سے کچھ ایسے
جیسے بچے لپٹ ، کے چلتے ہیں

چہرے پہچانے بھی ، نہیں جاتے
گرد میں ایسے اَٹ کے چلتے ہیں

ہم بھی عاصم شکیب ، کے جیسے
عام رستے سے ہَٹ ، کے چلتے ہیں

عاصم بخاری

غزلیں

جدھر بھی جاؤں ہے لگتا وہاں اداسی ہے
تمہاری آنکھ سے پھر کیوں نہاں اداسی ہے

بچھا کے جال اداسی کا کہتے پھرتے ہو
تمہارا وہم ہے دیکھو کہاں اداسی ہے

تمہارے ہجر کے موسم کے رنگ ہیں سارے
ہمارے حال کی بس ترجماں اداسی ہے

اداسیوں سے نبھانا تمہیں نہیں آتا
نجانے کس لئے تم کو گراں اداسی ہے

تمہارے ہاتھ بھی خالی تھے میرا دامن بھی
سناؤ رازِ دل اب رازداں اداسی ہے

نبھاتا کون ہے جیسے نبھایا ساتھ اس نے
ہمیں تو لگتی بہت مہرباں اداسی ہے

نائلہ راٹھور

غموں کو جو قدموں تلے ہم کچل دیں
فقط اہلِ دنیا کو چاہت کا پھل دیں

جو دل میں نہ رکھے عداوت نہ کینہ
جو ہے نسلِ نو، اُس کو ایسا عمل دیں

دِلوں میں محبت کے ہم گُل کھلائیں
کہ نفرت کے غُنچوں کو فوراً مسل دیں

بھٹکتے ہوئے لوگ پھر لوٹ آئیں
محبت کے اُن کو اگر چند پل دیں

سبھی نیچ جذبے ہوں جس میں ہویدا
کتابِ جہاں کو وفا کی غزل دیں

جو بچپن سے کردار کے ہوں مجاہد
چلو اپنے بچّوں کو ایسے بدل دیں

کہ مغرب سے مرغوب لوگوں کو خانم!
حدیثِ محمدؐ کا کوئی عمل دیں

فریدہ خانم

غزل

آپ گر ہم سے روٹھ جائیں گے
دل کی باتیں کسے سنائیں گے

خواب کیوں دیکھتے ہو الفت کے
کانچ جیسے ہیں، ٹوٹ جائیں گے

مت تماشا بنو محبت میں
دنیا والے ہنسی اُڑائیں گے

بات کرنے کا بھی قرینہ ہے
اپنے بچوں کو ہم سکھائیں گے

حاکمِ وقت ہم حواری نہیں
تیرے نخرے نہیں اٹھائیں گے

جتنی کوشش کرو بھلانے کی
اتنی شدت سے یاد آئیں گے

جس نے ڈسنا ہے ایک دن عابد
دودھ اس سانپ کو پلائیں گے

عابد معروف مغل

غزل

خوشیوں کو بڑی دیر سے میں تول رہی ہوں
خاموش زمانوں سے تھی اب بول رہی ہوں

دھرتی پہ کلی بن کے مہک رول رہی ہوں
آکاش پہ پر باندھ کے میں ڈول رہی ہوں

جیون میں حسیں شام و سحر ڈھال رہی ہوں
سانسوں میں محبت کا نمک گھول رہی ہوں

پنچھی! تجھے پنجرے سے رہا کرنے لگی ہوں
چڑیا! ترے سمٹے ہوئے پر کھول رہی ہوں

میں وہ ہوں کہ جوگی کا عصا بن کے رہی ہوں
میں وہ ہوں کہ درویش کا کشکول رہی ہوں

دنیا سے کہو صبر، پکارے نہ ذرا دیر
خوشبو بھری وادی میں ابھی ڈول رہی ہوں

یہ بات خریدار جیا جان چکے ہیں
بازار کوئی بھی ہو، میں انمول رہی ہوں

جیا قریشی

غزل

مجھے اَنا کے عِوض بے قیاس کھو دے گا
مَیں کہہ رہا ہوں تو اک غم شناس کھو دے گا

حیات جس نے بسر کی ہے بے خودی میں تمام
اگر وہ ہوش میں آیا حواس کھو دے گا

دیارِ غیر کے ہیں خواب تیری آنکھوں میں
مجھے یہ ڈر ہے تو اپنی اَساس کھو دے گا

یہ دل وبال سے بے باک ہوگیا اِتنا
کہ ایک روز یہ خوف و ہراس کھو دے گا

تری نگاہ خیالی جہاں میں بھٹکے گی
اگر تو شرم و حیا کا لباس کھو دے گا

زبیر خیالی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات بھر مجھ کو چراغوں نے ٹھہرنے نہ دیا
میں وہ لَو تھا جسے سورج نے اُبھرنے نہ دیا

غزل

کیوں ہے روتا نصیب کمتر پر
کر ادا شکر بھی میسر پر

میں تو پھرتا رہوں گا گلیوں میں
نیند سوئے گی میرے بستر پر

جو رلاتا تھا خود وہ روتا ہے
کیا عجب ہے ستم ، ستمگر پر

نرم نازک جبیں جو ٹکرائی
کیا ہی بیتی بچارے پتھر پر

وہ چلا ہے بہار ساتھ لیے
دھند چھانے لگی ہے منظر پر

میں نے مانا ثمرؔ برا ہوں ، مگر
مطمئن ہو گے مجھ سے بہتر پر؟

ثمر جمال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

حادثوں نے کر دیا شاعر مجھے
کام یہ بھی اکتسابی ہو گیا

غزل

دیکھو تو سہی کر کے شروعات کبھی
ممکن ہے کہ ہو جائے وہی بات کبھی

ایسے بھی جوابوں کو لیے پھرتا ہوں
پوچھے نہ گئے جن کے سوالات کبھی

رکھ دیتا ہوں حالت ہی بدل کر اس کی
اک بار جو لگ جائے مرے ہاتھ کبھی

پھل پھول بدن کی تو بہت سیر کروں
کھو جاؤں کہیں دیکھ کے باغات کبھی

ایسی کمی ہے جس کا نہیں کوئی علاج
تُو اور نہ کر وقت پہ بہتات کبھی

اور تو بڑی باتیں تجھے آتی ہیں، مگر
کر ایک اُسی موضوع پہ بھی بات کبھی

میں چاہتا تو اور ہی کچھ تھا لیکن
ہوتا رہا کچھ اور ہی مرے ساتھ کبھی

بے موسمے پھل میں نہیں ہوتی وہ بات
پہلے کیے دیتے یہ عنایات کبھی

گل فراز

غزل

کس طرح میرے سامنے اتنا سمٹ گیا
دشتِ طلب کا فاصلہ پل بھر میں کٹ گیا

مجھ کو ہوا ہے علم درختوں کے شور سے
اہلِ سخن کا رزق پرندوں میں بٹ گیا

جھیلا گیا نہ مجھ سے جو تنہائی کا عذاب
مجھ سے مرے وجود کا سایہ لپٹ گیا

حیران ہو رہا ہوں محبت کی راہ پر
اک شخص آتے آتے اچانک پلٹ گیا

دیکھا نہیں کسی کا مکمل وجود ہو
ہر شخص زندگی کے تقاضوں میں بٹ گیا

اک گلبدن کے نام سے منسوب کوئی شخص
سرمایۂ حیات کا کاسہ پلٹ گیا

محمد علی ایاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اَب تک ٹھاٹھیں مارتا ہے
دیکھ کے تجھ کو ، لہو مجھ میں

غزل

اک سانس جدا کھینچ اگر کھینچ سکے تو
اس گرد میں آ کھینچ اگر کھینچ سکے تو

جب آخری سر کاٹا تو کہنے لگا مجھ سے
اب سرخ ہوا کھینچ اگر کھینچ سکے تو

وہ ہاتھ چھڑاتا ہی رہا تادمِ آخر
میں کہتا رہا کھینچ اگر کھینچ سکے تو

ہم رات کے پیرائے میں محدود نہیں ہیں
کچھ خواب زدہ کھینچ اگر کھینچ سکے تو

ہر پھول ہے زندہ مرے گلدان بقا میں
اب قوس قضا کھینچ اگر کھینچ سکے تو

انصاف نہیں شور اگلتی ہے مرے دوست
زنجیر انا کھینچ اگر کھینچ سکے تو

دانیال احمد زمان

غزل

ہے سفر ایسا پلٹنے کا کوئی امکاں نہیں
گرد ہی باقی ہے آنکھوں میں کوئی ساماں نہیں

نام میرا یاد جو تم کو نہیں تو کیا ہوا
ایسی چیزیں بھول جانے میں کوئی نقصاں نہیں

کیسے اندازہ کروں میں شدتِ غم کا یہاں
دل میں جو برپا ہوا وہ آنکھ میں طوفاں نہیں

دیکھ کر آیا ہوں سب کو مسجد و مندر میں اب
ہیں سبھی دھنوان ہی ان میں کوئی یزداں نہیں

اپنے دل میں گھوم کر صحرا کا اندازہ ہوا
گھر جو ہے مجنوں کا وہ بھی اس قدر ویراں نہیں

ساتھ لے چل تو مجھے کہ راستہ ہے پر خطر
اے غمِ دوراں جو تیرے پاس کچھ ساماں نہیں

لب مرے زخمی ہیں آ کر دیکھ سکتے ہو شہاب
بوسے لینا یوں کسی پتھر کے تو آساں نہیں

شہاب اللہ شہاب

غزلیں

ترا خیال تو کارِ ثواب ہو جیسے
تمہارا ذکر بھی دل کا نصاب ہو جیسے

طوافِ یار کی خاطر نظر وضو میں رہے
وہ ایک چہرہ مقدس کتاب ہو جیسے

ترے جمال سے تتلی کو رنگ و روپ ملے
حسین عارض و لب ہیں، گلاب ہو جیسے

جہاں جہاں سے تو گزرا مہک گئے رستے
تمہارا لمس بھی خوشبو کا باب ہو جیسے

عزیز قدیر مغل

مجھے اشکوں سے وحشت ہو رہی تھی
جدائی پر وہ پگلی رو رہی تھی

میں خاموشی کے نہ مطلب کو سمجھا
نمی آنکھوں میں اس کے تو رہی تھی

وہ محرم بن رہا تھا اجنبی سے
کئی رشتے مگر وہ کھو رہی تھی

سہانی رت کے سپنے دیکھتی تھی
محبت دل میں خوشیاں بو رہی تھی

تمہارے وصل کی باتوں سے دل ہے رقص کناں
سرور و کیف ہے اتنا شراب ہو جیسے

عزیز ہار کے جیون تمہیں بھی پا نہ سکا
بسی ہو آنکھ میں اب کوئی خواب ہو جیسے

وفاؤں کی نہ میں نے قدر جانی
مری عقل و خرد تب سو رہی تھی

میں دوری کر بھی لیتا آج اس سے
مگر اک فکر بھی مجھ کو رہی تھی

غزل

سانس رکنے لگی ہواؤں میں
زہر شامل ہوا فضاؤں میں

زخم مدھم سے ہو گئے سارے
اب وہ شدت نہیں جفاؤں میں

دھوپ کی سختیوں کو سہہ سہہ کے
آج بیٹھے ہیں ٹھنڈی چھاؤں میں

بے دھیانی میں کھو دیا اس کو
جس کو مانگا تھا التجاؤں میں

دو قدم پر ہیں منزلیں شاہد
آبلے پڑ گئے ہیں پاؤں میں

رانا محمد شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ظاہر نہ کسی کور نظر پر بھی ہُوا میں
کیا فرق پڑا، تجھ پہ کُھلا، یا، نہ کُھلا میں

ڈائنوسار [کہانی]

جانتی، پری!

تین سو ملین سال پہلے یہاں چلنے پھرنے اور اڑنے والے ''ڈائنوسار'' بھی آئے تھے۔

انسان کے اترنے سے لاکھوں سال پہلے۔

ڈائنوسار آئے۔

ایک ایک ڈائنوسار ہمارے آج کے ہوائی جہاز سے بڑا تھا۔

گوشت خور پہلے آئے۔

''گوشت خور'' پہلے ہی آیا کرتے۔ زمین پہ گوشت بھرے جانور زیادہ ہو گئے تھے۔

انہیں صلب کرنا ضروری تھا۔

ایسے میں جنگل بہت بڑھ گئے۔ تب ''سبزی خور ڈائنوسار'' بنائے گئے۔ ایک ایک ڈائنو سار اپنی لمبی گردن اونچی کر کے، دیودار کے اوپر کی کونپلیں تک کھا جاتا۔

پھر پروں والے ''ڈائنوسار'' بھیجے گئے۔

وہ اپنے دیوہیکل جسموں کے ساتھ اڑتے پھرتے۔ جہاں شکار نظر آتا اُسے اُچک لیتے۔ ہڑپ کر لیتے۔

جانتی پھر کیا ہوا؟ پری۔

یہ کوئی ''فیری ٹیل'' نہیں، سچ میں یہاں ''ڈائنوسار'' آئے تھے۔

ہماری ''مارگلہ ہلز'' سے ایک مستری ٹوٹے پتھروں کی ایک ٹرالی بھر کے لایا۔ اُسے میرے لان میں اک چھوٹی آبشار قسم کی ڈیکوریشن بنانا تھی۔ میں اُس کے ساتھ بیٹھا تھا، جب وہ ہتھوڑی سے لائے ہوئے سیاہی مائل سجاوٹی پتھر توڑ توڑ کے لگا رہا تھا۔

وہ خود بھی جانتا تھا، جب وہ پتھروں میں خون کی شریانیں دیکھتا، جمی ہوئیں تھی۔

وہیں پتھروں میں حیوانی جسم کے سبھی عضو کے ٹکڑے تھے۔ میں ڈاکٹر ہوں، بیٹھا حیران ہوئے جاؤں۔ وہ ہنس کے کہے، یہ ''فوگزے'' بندوں کا جسم ہے۔

ابدال بیلا

قدیمی جسم پتھر میں جم کے پتھر بنا ہوا ہے۔
اُدھر نیویارک، پیرس، لندن کے عجائب گھر
ان ''ڈائنوسار'' کی ہڈیوں کے سالم پنجرے
بھرے۔ ہماری ان کی پرانی آماجگاہوں پہ
بجری بنانے کی بدشکل بدہیت فیکٹریاں لگی
ہیں، جو پہاڑیوں کو یوں کھا رہی ہیں، جیسے
کبھی بڑے ''ڈائنوسار'' بھی نہ کھا سکے۔
پری، انہیں رو کے کون؟
تم اب بھی سوچتی ہو گی کہ یہ سارے
''ڈائنوسار'' کہاں چھپ گئے؟
یہ سارے ''ڈائنوسار'' کدھر گئے؟
یہ چھیاسٹھ ملین سال پہلے کی بات ہے۔
آسمان سے کوئی چھ میل لمبی اور اتنی ہی
چوڑی ''چٹان'' حفاظتی حصار زمین کا توڑ
کے زمین سے ٹکرائی۔
خوفناک دھماکا ہوا۔
زلزلہ آیا۔
چٹان گر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔
مہینوں تک زمین کی فضا سوگوار رہی، دھول،
مٹی اور کنکر اُڑ اُڑ کے زمین پہ غبار کا بادل
بن کے چھائے رہے۔
اندھیرا ہو گیا۔
اندھیرے میں خنکی ہوئی۔
سورج کی دھوپ جو رک گئی۔
مہینوں سالوں ایسا موسم رہا۔
اُس اندھوناک سردی میں سارے
''ڈائنوسار'' مر گئے۔
جہاں جہاں وہ تھے، وہیں زمین میں
پیوست ہو گئے۔
تم کہو گی اس میں کیا حکمت؟
کیا واقعی یہ تمہارا سوال؟
تو سنو، پری۔
ایک ایک ''ڈائنوسار'' کو تم آج کی زبان
میں ''تیل کا ٹینکر'' سمجھو۔ اُن کی ہڈیوں سے
کیا نکلا؟
تیل۔
اُن کے گوشت پوست سے کیا باہر آیا۔
تیل۔
یہ خدا نے آنے والے وقتوں میں انسان
کے لیے خزانے بنا کے چھپا دیے۔
سن پری، تم مجھے ''ڈائنوسار'' کے علاقے
بتاؤ۔
میں وہیں سے تیل نکالنے کا کنواں کھودتا۔
دیکھ پری، کائنات کا سب سے لاڈلا زمین
پہ اتارنا تھا۔
''بندہ''
تیاری تو زمین پہ کرنی تھی۔ سب خزانے چھپا
کے کہ وہ آئے اور انہیں ڈھونڈے۔ اسے

تلاش رب کی ہو۔ صرف جو پالنے والا، جو پالنے والے کے ذکر سے بندھا رہے، وہ ''بندہ''، ''زمین'' کے دسترخوان سے جو اپنے حصے سے بڑا نوالہ نہ توڑے - وہ ''بندہ'' جدھر چلے وہ ''رستہ'' - دیکھ ''ڈائنوسارز'' کا آنا اور جانا سمجھ۔

کہنے کو ''ڈائنوسار'' کا زمانہ چھیاسٹھ لاکھ سال پہلے کا ہے۔

یہاں سائنس دان غلطی کر گئے۔

''ڈائنوسار'' آج بھی ہوتے ہیں۔

تم حیران چہرہ بنا کے، آنکھیں کھول کے پوچھو گی، کدھر؟

میں ''جیراسک پارک'' فلم کی بات نہیں کر رہا۔ اپنے ملک کی بات کرنے لگا ہوں۔

تو سنو۔

یہ آج کی ''راج گدی'' پہ کون بیٹھے ہیں؟

''ڈائنوسار''

آج کی ''سٹاک ایکسچینج'' میں کروڑوں اربوں کا روز بیوپار کرنے والے کون ہیں۔

''ڈائنوسار''

بڑے بڑے گھروں میں کون رہتے ہیں؟

''ڈائنوسار''

خدا نے بڑے گھر والوں کے لیے لفظ استعمال کیا، ''فرعون''۔ اس لیے ''ڈائنوسار'' سارے ''فرعون'' بھی ہوتے۔

ان فرعون، ''ڈائنوسار'' لوگوں کے ایک ناشتہ میں آج کے ہمارے آدھے شہر یا چھوٹے پورے قصبے کے غریب غربا کی ساری آمدن، اُن سے لیے ٹیکس کی صورت ان کی ہڈیوں سے نچوڑا رس، سب پی جاتے ہیں۔

کھا جاتے ہیں۔

پورے شہر کے لوگ، کھاتے پیتے، آتے جاتے، ہر شے پر جو ٹیکس دیتے، یہ اُس سے ایک ناشتہ کرتے۔ دوپہر کے کھانے تک یہ تین چار اور شہروں اور ان کے دیہات کے لوگوں کے ادا کیے سارے ٹیکس سے پیٹ بھرتے۔

تم کہو گی، غریب کب ٹیکس دیتے؟

حیرت ہے، تم یہ پوچھتی ہو، پری۔

تم سادہ پانی کی بوتل لو،

اُس پہ ٹیکس۔

تم کوئی سوفٹ ڈرنک لو۔

اُس پہ ٹیکس۔

تم سگریٹ پیو۔

اُس پہ ٹیکس۔

تم ماچس لو۔

اُس پہ ٹیکس۔

تم آٹا لو۔

اُس پہ ٹیکس۔
تم نمک لو۔
اُس پہ ٹیکس۔
کوئی چیز ایسی ہے، جس پہ ٹیکس نہیں؟
بتاؤ۔
کفن کے لٹھے پہ بھی ٹیکس۔
سمجھی۔
تبھی تو میرے بابا کہتے تھے،
یہ "بادشاہ" یہ حکمران سب سے بڑے بھکاری ہیں۔
یہ تو ایسے بھکاری ہیں جو بھکاریوں سے بھی ٹیکس لے کے پلتے ہیں۔
ان کا پلنا تو دیکھو۔
یہ ان کے محلات۔ محلات کی شان و شوکت،
زرق برق۔
سونے چاندی سے سجے ان کے ایوان، شہر بھر کی ہر سنہری شے سے سجے ان کے دیوان۔
یہ چلیں تو راستے بند۔
ان کے آگے پیچھے تمہارے میرے جیسے ٹوٹے پھوٹے لوگوں کو سجا بنا کے فوج در فوج۔
ہوٹر والی گاڑیاں
مرغابیوں کی ڈار جیسے
موٹر سائیکلوں کے قافلے
ان کے بیچوں بیچ یہ۔
ہمارے ٹکے ٹکے پہ پلتے حکمران۔
کتنی تگ و دو کرتے یہ حکمرانی کے لیے
جانتی کیوں؟
اس لیے کہ صرف یہی وہ "ڈاکہ" ہے، جس پہ انہیں "ڈاکو" نہیں ہم اپنا حکمران کہتے ہیں۔
ہیں یہ سارے "ڈائنوسار"۔
ان کے گھر تو دیکھو۔
جتنے تمہارے میرے پورے ایک شہر کا رقبہ،
اتنا اس ایک "ڈائنوسار" کا گھر۔
"فرعون"
یونہی تو نہیں خدا نے اپنی "کتاب" کا تین چوتھائی حصہ ہر "بڑے گھر" والے کی لعن طعن میں لکھا۔
مگر تم اور میں۔ ہم سب۔
خود یہی خواب پالے بیٹھے ہیں کہ کسی "ڈائنوسار" کے منظورِ نظر ہوں، یا خود کبھی "ڈائنوسار" ہوں۔
ہیں نا؟
سچ کہنا۔
یہی گندا "رستہ" سوچا ہوا ہے نا؟ ہم نے۔
یہی خواب ہیں نا ہمارے۔ ڈرٹی ڈائنوسار۔

☆☆☆☆☆

پیاری صباحت

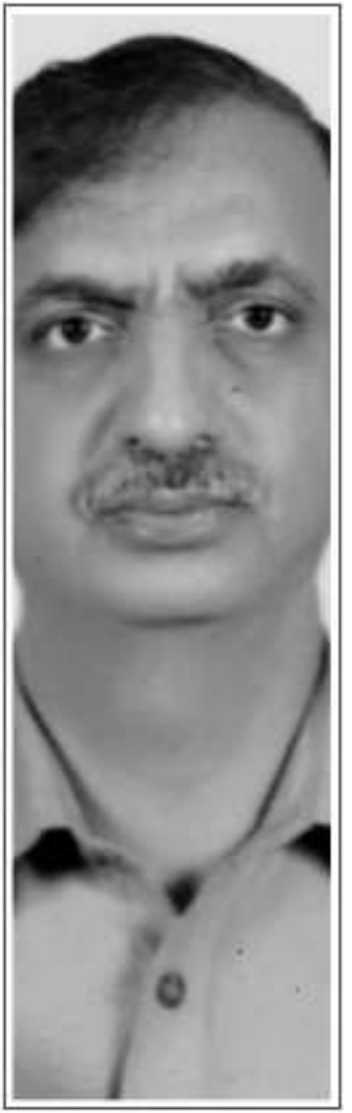

حبیب الرحمٰن

پیاری صباحت آج کی رات اگر بہت خنک اور دھند آلود نہ ہوتی تو شائد میں اس خاموشی سے تم تک پہنچ نہ پاتا اور شائد اس سکون سے بہت سی باتیں بھی نہ کر سکتا---صباحت گاؤں بہت بدل گیا ہے بوہڑ کا درخت ٹنڈ منڈ ہو گیا ہے اور اس پر اب کسی پرندے کا گھونسلہ نہیں رہا۔ دن کے وقت پتہ نہیں کوئی اس کے نیچے بیٹھتا بھی ہے یا نہیں۔ بوہڑ کے عقب میں قبرستان اب کچھ پھیل گیا لیکن اس کا پھیلاؤ بیریوں اور ٹاہلیوں کے درختوں کو نگل گیا ہے۔ بیریوں کے وہی درخت جن کے تلے ہم بچپن کی دوپہریں گزارا کرتے تھے۔ لڑکے بالے بلور اور کنچوں سے کھیلتے اور تم دوسری لڑکیوں کو ساتھ رسی ٹاپتی اور پٹھو گیرم کھیلا کرتیں۔ تمھیں شائد یاد بھی نہ ہو کہ جب تم کھیلتے ہوئے زخمی ہو کر رویا کرتیں تو میں ننھی کہہ کر تمھارا کتنا مذاق اڑایا کرتا تھا اور تم میرے مذاق اڑانے سے مزید رویا کرتیں اور خالہ سے شکایت بھی کرتیں۔

نہ رلایا کر صباحت کو -- خالہ مجھے ڈانٹتے ہوئے کہتیں

ننھی روتی بھی تو کتنا بے سرا ہے ہیں خالہ --- میں ہنستے ہوئے کہتا تو خالہ قریب پڑی جوتی اٹھا لیتیں

صباحت کہتے ہوئے درد ہوتا ہے تجھے

--- ننھی کا بچہ نہ ہو ہو تو

صباحت پروین کہتے ہوئے میری زبان تھک جاتی ہے میں ہنستا تو خالہ مسکراتے ہوئے جوتی زمین پر پھینک دیتیں اور رسوئی سے میرے لیے ٹھنڈی لسی لینے چلی جاتیں اور تم اس عرصے میں اپنی لڑائی بھول کر میری اور خالہ کی نوک جھونک میں گم ہو جاتیں--

پیاری صباحت------ تمھیں تو تب بھی پتہ تھا کہ میری ماں نے مرنے سے بہت پہلے تمھیں میرے لیے مانگ لیا ہے -- لیکن میں شہر کے سکول میں پڑھنے والا ماں کی بات کے مان کو کہاں سمجھتا تھا مجھے تو تمھارے سمیت گاؤں سے جڑی ہر چیز پاؤں کی زنجیر لگتی تھی مجھے آگے بڑھنا تھا-- بہت آگے--- اور اس آگے بڑھنے کی جستجو کی وجہ بھی تم تھیں-- تم نے اور خالہ نے میری ماں کے ان دیکھے خواب کو میرے لاشعور میں اس طرح بٹھا دیا کہ مجھے تو کبھی احساس ہی نہ ہو سکا کہ میں آگے بڑھنے کے جتن کر رہا ہوں اور گاؤں میں بیٹھی ننھی اب بھی میری منتظر ہے- میں آگے بڑھتا رہا سکول سے دوسرے شہر میں کالج کے ہوسٹل پھر یونیورسٹی اور پھر مقابلے کا امتحان میں کامیاب ہونے تک میں نے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا -- میں افسر بن گیا اور تم وہی رہیں--- گاؤں میں رہنے والی ایک پرائمری پاس لڑکی--- کئی بار جی چاہا کہ بابا سے صاف کہہ دوں کہ خالہ سے صاف انکار کر دیں لیکن پھر بابا کا خوف اور خالہ کی محبت مجھے گنگ کر دیتی--- پیاری صباحت آج میں اقرار کرتا ہوں کہ سب کچھ پا لینے کے باوجود تمھاری محبت اور تمھارے سراپے کو میں دل سے کبھی بھی نکال نہیں سکا تھا--- تم سے شادی کا فیصلہ ابا مرحوم کا فرمان اور خالہ کی ضد نہیں تھی-- میری محبت تھی---- مجھے اپنی محبت کا اقرار بہت پہلے کر دینا چاہیے تھا لیکن تمھیں پا کر اور تمھیں اپنی زندگی میں لانے کے باوجود تمھیں ابا اور خالہ کا زبردستی کا فیصلہ ہی کہتا رہا --- تم نے میری زندگی میں رنگ بھر دیئے اور وہ شخص جو کبھی بھی رات گئے سے پہلے گھر نہ لوٹتا تھا شام سے بہت پہلے گھر پلٹنے لگا--

پیاری صباحت مجھے تب ہی تم سے کہہ دینا چاہیے تھا کہ مجھے تمھاری محبت گھر کھینچ لاتی ہے لیکن میں ہمیشہ دفتر کی بڑھتی ہوئی مصروفیات ہی بتاتا رہا

پیاری صباحت تم نے میری خاطر اپنے آپ کو کتنا بدلا -- کپڑوں کے ڈیزائن اٹھنے بیٹھنے کے طور طریقے انگریزی کے بہت سے لفظ ---- گاؤں سے آ کر کوئی ملنے والا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ وہی ننھی ہے--اب سرکاری دعوتوں میں تمھارے ساتھ جانا شرمندگی کا باعث نہیں لگتا تھا یہ الگ بات کہ میں تمھارا مذاق ہی اڑاتا رہا کہ کونسا رنگ رات کی دعوت کے لیے پہن لیا جوتے کس طرح کے پہن لیے اور فلاں لفظ کیسے بولا --- تمھاری آنکھوں میں میری باتیں سن کر آنسو آ جاتے لیکن تم کبھی گلہ نہ کرتیں اور رندھی ہوئی آواز

میں کوئی اور بات شروع کر دیتیں -- پیاری صباحت آج میں اقرار کرتا ہوں کہ میں غلط تھا تم اس وقت بھی حسین تھیں اور تمہارے کپڑے جوتوں کی کمبی نیشن تب بھی بے مثال تھی تم اسے مردانہ شاونزم کہو میری انا کہو یا کچھ بھی --- میں غلط تھا --- اور سچ تو یہ ہے کہ تمہاری وجہ سے میں زیادہ حوصلہ مند رہا سچ پوچھو تو کئی بار سوچتا ہوں کہ تمہاری جگہ میرے اکثر دوستوں کی بیویوں کی طرح آکسفورڈ یا کنیرڈ کی پڑھی بیوی ہوتیں تو مجھے کتنا ڈی گریڈ کرتیں میرے پینڈو بیک گراؤنڈ میرے کمزور انگریزی لہجے کا کتنا مذاق اڑاتیں--- پیاری صباحت تم نے مجھے کبھی ڈی گریڈ نہ ہونے دیا ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھایا لیکن میں سب کچھ پتہ ہونے کے باوجود اپنی دنیا میں ہی گم رہا۔

پیاری صباحت پھر بچے دنیا میں آ گئے تمہاری دنیا تقسیم ہوگئی اور میری دنیا مزید خوشیوں سے بھر گئی تم نے بچوں کی بہت اچھی تربیت کی انہیں کبھی احساس ہی نہ ہونے دیا کہ ان کا باپ ان کی ماں کے بارے میں کیسے سوچتا ہے کبھی غصے میں کہہ کر تمہارے گنوار پن ان پڑھ اور دیہاتی ہونے کی بات کر بھی دیتا تو تنہائی میں آنکھوں میں آنسو سمیٹے تم میرے پاس آ کر بچوں کے سامنے ایسا نہ کہنے کی درخواست کے علاوہ کچھ نہ کہتیں -- پیاری صباحت میں نے جب بھی تم سے اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہا میرے لاشعور میں چھپا احساس برتری جانے کہاں سے عود آیا اور وہ محبت بہت دور کھو گئی جو میرے دل میں نہاں تھی --- پیاری صباحت میں اقرار کرتا ہوں کہ میرا رویہ غلط تھا میری سوچ غلط تھی

پیاری صباحت پھر ایک فارن مشن میں تین سال کے لیے میرا نام آیا تو تم کتنی خوش تھیں دو بچوں کے ساتھ ہم تین سال ویانا رہے تم کس قدر بدل گئیں تم نے بچوں کو یورپ کی تاریخ سے روشناس کرایا ایک ایسی تاریخ سے جو شائد تم نے بھی پہلی بار پڑھی تھی۔ میں خود بھی تمہارے ساتھ اوپیرا میں جا کے پریشان تھا کہ تم اتنا کچھ کیسے جان گئی ہو لیکن میں گوگل کاپی پیسٹ کہہ کر تمہارا مذاق اڑاتا رہا --- تمہارے کہنے پر ہم موزارٹ کا شہر سالزبرگ بھی دیکھنے گئے موزارٹ کا گھر اس کے راستے کی خوبصورتی واقعی مسحور کن تھی لیکن میری انا تمہاری تعریف نہ کرا سکی--- پیاری صباحت اب بھی گاڑی میں میں صرف موزارٹ کی دھنیں سنتا ہوں اس کی سمفنی سے تمہارا پیار کشید کرتا ہوں جس کا اظہار کبھی بھی تم سے نہیں کر سکا۔

پیاری صباحت ایک سٹیشن سے دوسرے سٹیشن جاتے جاتے بچے اپنی دنیاؤں میں چلے گئے اور ہم دونوں پھر تنہا رہ گئے پیاری صباحت ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم اس وقت کو زندگی بھر کی نعمتوں پر شکر کرتے اور گزرے وقتوں کو یاد کر کے خوش ہوتے میں نے تم پر چڑنا اور بے وجہ لڑنا شروع کر

دیا مجھے نوکری ختم ہونے کی فکر تھی اور بڑھاپے میں ہونے والی بیماریوں کے وسوسے بھی مجھے ستاتے تھے لیکن تم سے یہ سب شیئر کرنے کے بجائے تمھیں آنے والی تکلیفوں کا منبع سمجھتے ہوئے بے وجہ لڑنے اور بحث کرنے لگا اب تم کچھ بھی کہنے کے بجائے موٹے موٹے آنسو آنکھوں سے لڑھکاتی اور ٹشو سے آنکھیں پونچھ کر چپ ہو جاتیں۔

کاش تم زندگی میں ایک بار مجھ سے جی بھر کے لڑ کر اپنی بھڑاس نکال لیتیں تو آج اتنا پچھتاوا نہ ہوتا۔

پھر ریٹائرمنٹ ہو گئی ہم دونوں اسلام آباد کے ایک پوش علاقے میں شفٹ ہو گئے---- اسلام آباد کلب، گالف اور پرانے ساتھیوں کی کمپنی ایک بار پھر مجھے مصروف رکھنے لگی۔ پچھلے سال گالف ٹورنامنٹ میری فتوحات کے نئے سلسلے سے شروع ہوا لیکن تمھارے اچانک بیمار ہو جانے اور ہسپتال منتقل کیے جانے کی اطلاع نے گالف ٹورنامنٹ سے نہ صرف مجھے فارغ کرا دیا بلکہ جس ٹرافی کا اس سال مجھے پکا یقین تھا وہ بھی ہاتھ سے نکل گئی۔۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن تمھیں اس حالت میں دیکھ کر بھی میں اپنے گالف کے ٹورنامنٹ کا ماتم ہی کرتا رہا۔۔ مجھے تو احساس ہی نہیں ہوا تم کتنی کمزور ہو گئی ہو اور تمھاری رنگت کس قدر پیلی پڑ گئی ہے---- مجھے یہ جان کر کہ تمھیں جگر کا کینسر ہو چکا ہے تمھارا ہاتھ تھام کر کہہ دینا چاہئے تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور میں تمھارے بغیر نہیں جی سکتا --- لیکن میں کچھ بھی نہیں بولا اور سول سروس کے افسروں کی طرح ملازموں اور ڈاکٹروں کو ضروری ہدایات دے کر گالف کورس واپس پہنچ گیا جہاں انعامات کی تقسیم کے موقعہ پر میرا ہونا بہت ضروری تھا

پیاری صباحت ------- تم دنیا سے چلی گئیں۔ تمھاری خواہش پر تمھیں گاؤں میں ہی دفن کیا۔ سچ پوچھو تو جی بہت چاہا کہ کھل کر روؤں اور جی بھر کے تمھارا ماتم کروں لیکن مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ تمھارے کاندھے کے علاوہ کوئی کاندھا ہی نہیں جس سے لگ کے رویا جا سکتا ہو۔ بیٹا امریکہ سے آ نہیں سکا بیٹی کی ڈلیوری تھی وہ بھی نہیں آئی۔ گاؤں میں کوئی ایسا تھا نہیں جس سے دل کی بات کرتا دو دن سوگ کے بعد گھر لوٹا تو تمھاری یاد ڈسنے لگی شام ڈھلے گاؤں لوٹ آیا ہوں سردی اور دھند کے باعث سارا گاؤں کب کا سو چکا قبرستان کے باہر گاڑی کھڑی کر کے تمھاری قبر کے سرہانے بیٹھا ہوں دیکھ لو آج میں نے تمھیں ایک بار بھی ننھی نہیں کہا تم تب بھی پیاری صباحت تھیں اور اب بھی پیاری صباحت ہو۔ گاؤں کا قبرستان ہمیشہ کی طرح آج بھی ویران ہے دھند آلود خنک رات میں تمھارے سرہانے بیٹھ کر کتنی ہی دیر سے سوچ رہا ہوں کہاں لوٹ کر جاؤں کس کے کاندھے پر سر رکھ کر روؤں -------

☆☆☆☆☆

بڑا فریضہ

رات کے پہلے پہر اور کبھی پچھلے پہر سوتے میں مکرم کی آنکھ اچانک کھل جاتی ہر بار وہ اپنے تکیے کے نیچے رکھے ہوئے موبائل فون پر وقت دیکھتا اور دوبارہ آنکھیں موند لیتا اور نیند لانے کی کوشش کرتا۔ اسے بار بار خیال آتا کہ کہیں اسے صبح تاخیر سے بیداری کے سبب درخواست فارم جمع کروانے میں دیر نہ ہو جائے۔ اذان فجر کے ساتھ ہی وہ اٹھ بیٹھا اور ریموٹ سے ائیر کنڈیشن آف کر کے نماز فجر کیلئے وضو کرنے باتھ روم میں چلا گیا۔ باتھ روم سے واپسی پر اس نے اپنی بیگم کو آواز دی،

رقیہ ---- رقیہ ---- اٹھو پلیز!

فجر کی نماز میں بہت کم وقت رہ گیا ہے اٹھو شاباش ------ نماز پڑھ لو۔

پھر جلدی سے میرے لئے ناشتہ بناؤ۔ آج میں نے حج کیلئے درخواست فارم جمع کروانے آفس پہنچنا ہے دو گھنٹے کا سفر بھی ہے۔

"باہر تیز آندھی اور طوفان کے باعث دروازے اور کھڑکیاں آپس میں ٹکرانے اور ہوا کے شور سے سیٹی جیسی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں"

رقیہ نے اٹھتے ہی کھڑکی کا پردہ پیچھے کر کے باہر دیکھا تو ہواؤں کے تیز جھونکوں سے درخت جھکے جا رہے تھے۔

آپ مسجد جا رہے ہیں؟

بارش کا موسم ہے میں گھر پر ہی نماز پڑھوں گا۔ مکرم نے لاؤنج میں جائے نماز بچھا کر نماز پڑھی اور پھر قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف ہو گیا کچھ ہی دیر میں رقیہ بھی برابر میں بچھی جائے نماز پر نماز پڑھ کر کچن میں ناشتہ بنانے چلی گئی۔ مکرم نے تلاوت کے بعد قرآن پاک کو چومتے ہوئے اپنی آنکھوں پر لگایا، چہرے پر مس کیا اور پھر اس پر غلاف چڑھا کر الماری میں رکھ کر ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

کھڑکیوں کے درمیانی وقفے اور دروازوں کے نیچے سے گزرتی ہوئی ہوا کے جھونکوں سے پیدا ہونے والے شور نے خوف کا ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ ہوا کی دل خراش آوازیں کچھ ایسی تھیں جیسے تنہا شخص جنگل سے گزر رہا ہو اور ہر طرف درختوں کے پتے اور ٹہنیاں ٹکرانے سے سنسناہٹ پیدا ہو رہی ہو۔

دونوں شیر خوار بچے کے جاگ جانے کے

عبدالرؤف کیانی

خوف سے آہستگی سے باتیں کرتے، رقیہ کچن کے برتن ادھر ادھر آرام اور احتیاط سے رکھ رہی تھی۔ اس نے کچن سے آواز دی مکرم کمرے کا پنکھا چلا دیں آپ نے ائیر کنڈیشن بند کر دیا تھا کہیں شمروز نہ جاگ اٹھے، اتنے میں بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ مکرم کمرے کی طرف بھاگا وہ بچے کو لوری دیتے ہوئے اس کے سینے کو ہلکے ہاتھ سے تھپکتے ہوئے اللہ ہو، اللہ ہو گنگناتے ہوئے سلانے لگا۔ مگر بچے کی نظریں ماں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ بچے نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور پھر رونے لگا۔

''رقیہ فیڈر دے جاؤ یہ ایسے چپ نہیں ہوگا''

''آخر بیٹا کس کا ہے''

''رقیہ نے فیڈر مکرم کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا''

بچے نے ماں کو دیکھتے ہی روتے ہوئے اپنے ہونٹ بتیسیوں میں بھینچ لئے۔ مکرم نے بچے کو فیڈر سے دودھ پلانا شروع کیا بچے کا رونا بند ہوگیا اور اس نے دودھ پیتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ مکرم آرام اور احتیاط سے اٹھ کر کھانے کے ٹیبل کے قریب لگی کرسیوں پر جا کر بیٹھ گیا۔

ناشتہ لے آؤ بیگم!

باہر گرج چمک کی وجہ سے موسم سخت خراب ہے میں جلدی جانا چاہتا ہوں کہیں حج فارم جمع کروانے میں دیر نہ ہو جائے۔

اتنے میں بیگم نے ناشتے کے ٹیبل پر ناشتہ چنتے ہوئے کہا یس سرکار ناشتہ حاضر ہے۔

مجھے بھی ساتھ لے جاتے تو کیا ہی بات تھی۔ میں بھی اللہ کے گھر کا دیدار کر لیتی۔ میری حسرت بھی پوری ہو جاتی۔

ہاں مگر میرے نصیب اتنے اچھے کہاں؟ رقیہ نے یہ کہتے ہوئے ایک لمبی آہ بھری اور کولر سے پانی لینے کچن میں چلی گئی۔

''ناشتہ کرتے ہوئے رقیہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے''

شمروز چھوٹا نہ ہوتا تو تمہیں بھی ساتھ لے جاتا۔ میرے پاس بس یہی رقم تھی۔ سوچا چلو حج بڑا فریضہ ہے ادا کر آؤں مکرم نے اسکی آس بندھاتے ہوئے کہا۔

وہ کہتے ہیں نا۔

''وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیزگار''

اس کا کیا مطلب ہے؟ رقیہ نے مکرم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

اس کا مطلب ہے بڑھاپے میں بھیڑیا بھی پرہیزگار ہو جاتا ہے۔ اللہ کو جوانی کی عبادت بہت پسند ہے۔

تیز ہوا سے دلان کے دروازے اور کھڑکیوں کے ٹکرانے کی آواز سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دروازے پر کوئی شخص مسلسل دستک دے رہا ہو۔ رقیہ نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے چونکنے انداز

میں کہا

باہر دروازے پر دستک ہو رہی ہے؟

نہیں تو! بادل گرج رہے ہیں۔

آپ باہر جا کر دیکھ کیوں نہیں لیتے؟

یہ گرجنے والے برستے کم ہی ہیں۔ پتہ نہیں آج بس سٹاپ سے گاڑی ملتی بھی ہے یا نہیں۔ مکرم نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

ناشتہ کرنے کے بعد مکرم نے کپڑے تبدیل کیے شوز پہنے اور پاسپورٹ شناختی کارڈ اور ضروری کاغذات جیب میں رکھتے ہوئے جلدی جلدی پرفیوم اٹھا کر اپنی بغلوں کے نیچے اور سینے پر سپرے کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکلا

وہ دھیمی آواز میں لبیک اللھم لبیک پکارتا ہوا بولا، بیگم دروازہ بند کر لو میں جا رہا ہوں۔

مکرم نے جونہی دالان کا دروازہ کھولا باہر تیز آندھی کے ساتھ بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ اس نے پلٹ کر آواز دی۔

بیگم، ---- بیگم --- ارے رقیہ ---- کہاں ہو! سنو تو!

شمروز کا خیال رکھنا۔ میں شام تک واپس آ جاؤں گا۔ تم بس دعا کرنا۔

وہ خود کلامی کرتے ہوئے کہہ رہا تھا حج بڑا فریضہ ہے یہ فریضہ ادا ہو جائے تو انسان کے سارے گناہ دھل جاتے ہیں کاش میں گنہگار بھی اللہ کے گھر کے طواف کیلئے چن لیا جاؤں۔

وہ باہر جانے کیلئے دروازے کی طرف بڑھا تو دروازہ کھٹکنے کی آواز سنائی دی۔

اس نے چٹخنی پیچھے کی دروازہ کھولا تو باہر ایک ضعیف العمر عورت کھڑی تھی اس کے چہرے پر پژمردگی کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے اپنا کمزور اور ناتواں ہاتھ کانپتے ہوئے مکرم کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

بیٹا! بیوہ عورت ہوں اللہ اور رسولؐ کے نام پر میری کچھ مدد کرو۔ میری جوان بیٹیاں ہیں اور کمانے والا کوئی نہیں ۔ صدقہ، زکوۃ، خیرات کی مستحق ہوں جھوٹ نہیں بول رہی۔ خدا کے سوا میرا کوئی آسرا نہیں وہ عورت کے مایوس کن چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا بارش کے سبب اس کے بھیگتے ہوئے کپڑے دیکھ کر اس نے اپنے اندر ہمدردی آمیز احساس پایا۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا مگر چینج نہ ہونے کے سبب پشیمانی محسوس کرتے ہوئے سو روپے کا نوٹ اسے تھماتے ہوئے کہا

یہ لو دعا کرنا میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔ وہ اس کے بچوں اور اسے ڈھیروں دعائیں دیتی ہوئی آہستہ آہستہ لڑکھڑاتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔ وہ اسے حیرانگی سے دیکھتا رہا اور سوچوں میں کھو گیا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوئی تو دروازہ بند کر کے لاؤنج میں داخل ہوا کھونٹی پر لٹکی چھتری اٹھا کر آواز لگانے لگا۔

بیگم میں جارہا ہوں دروازہ بند کرلینا۔
آپ ابھی تک ادھر ہی ہیں۔ باہر بارش ہو رہی ہے۔ اس لئے چھتری لینے واپس آیا تھا۔ اور ہاں باہر ایک عورت کو میں نے بھیک دی ہے۔ اب دروازہ بند کرلینا، بھکاری جمعہ کے روز بہت تنگ کرتے ہیں۔ میں ساتھ ہی چلتی ہوں آپ پھر کسی مانگنے والے کی ہمدردی کیلئے رُک جائیں گے۔ مانگنا تو ان لوگوں کا پیشہ ہے۔
آپ مفت میں وقت برباد کردیتے ہیں۔ جلدی جائیں آج جمعہ کا دن ہے دفتری اوقات بھی کم ہیں
اتنے میں پھر دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔
رقیہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو باہر ایک عمر رسیدہ اور ناتواں بزرگ آنکھوں پر موٹے شیشوں والا چشمہ، سر پر سفید رنگ کی پگڑی پہنے اور ہاتھ میں عصا تھامے کھڑے تھے۔ وہ کانپتے ہوئے بولے۔
بیٹا راشد گھر پر ہی ہے؟
وہ اندر کی طرف لپکی اور کہنے لگی
لو جی اب کوئی اور منگتا باہر کھڑا ہے۔ اسے بھی سو پچاس دو اور جلدی سے نکلو۔
مکرم آگے بڑھا باہر دیکھتے ہی حیرانگی سے بلند آواز میں پکارنے لگا ماسٹر صاحب --
ماسٹر صاحب آپ اس وقت خیریت؟
وہ ان کا بازو تھامتے ہوئے انہیں اندر لے آیا
رقیہ یہ ہمارے ماسٹر فیروز دین صاحب ہیں۔
اس نے انہیں لاکر بیٹھک میں بٹھادیا۔ اور بیگم کو کہنے لگا ماسٹر صاحب کیلئے چائے لے آؤ
آپ نے ناشتہ کیا ہے؟ مکرم نے پوچھا
''بیٹا میں ناشتہ کرکے آیا ہوں۔ میرے ناشتے کی فکر نہ کرو''
وہ ماسٹر صاحب کی آمد کو اپنے لئے باعث خیر و برکت تصور کر رہا تھا۔ اور فخر محسوس کر رہا تھا
زمانہ طالب علمی میں ماسٹر صاحب کی نصیحتیں اور پرائمری سکول کی یادیں راشد کے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔
وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا!
ماسٹر جی وہ بھی کیا حسین دن تھے سکول میں ٹاٹوں پر بیٹھ کر پڑھنا، سرکنڈوں اور بانس کی قلمیں آپ سے تراشوانا پھر روشنائی سے لکڑی کی تختیوں پر لکھنا۔
دونوں کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور خوب اپنے ماضی کو یادیں دہراتے ہوئے کبھی ہنستے اور کبھی خاموش ہوجاتے۔
آپ کا رعب اور غصہ ایسا تھا کہ ہر بچہ آپ سے ڈرتا تھا۔ سکول کے ماسٹر بھی آپ کے علمی خرافت کے قدر شناس تھے۔
ماسٹر جی یاد آیا۔ آپ کی بیٹی کا کیا حال اس وقت وہ چھوٹی سی تھی جب ہم نے پرائمری پاس کرنے کے بعد مڈل سکول میں داخلہ لے لیا تھا۔
بیٹا سلمٰی اب جوان ہے چند روز بعد اس کی

شادی ہے بہت پریشان ہوں اسی لئے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تمہارے گھر تک پہنچا ہوں مالی حالات دگرگوں ہیں۔ پنشن سے گھر کی گزر بسر چل رہی ہے۔
غربت کی وجہ سے اکلوتی بیٹی کا رشتہ سگے رشتہ داروں اور بہن بھائیوں تک نے ٹھکرا دیا۔ بیٹی نے ایم ایس سی کا امتحان پاس کر لیا تھا۔
غیر برادری کے لڑکے کے ساتھ دو سال سے منگنی کر رکھی تھی وہ لوگ شادی کیلئے مجبور کر رہے تھے اور مجھے جہیز کیلئے کوئی سبیل نظر نہیں آرہی تھی تھوڑا بہت قرض لیکر کچھ چیزیں بنوائی ہیں کچھ چیزیں خریدنی ابھی باقی ہیں اس دور میں دو وقت کی روٹی عزت و آبرو کے ساتھ پوری ہو جائے تو غنیمت ہے۔ اتنے میں رقیہ نے ٹیبل پر چائے رکھی۔
چائے پیتے ہوئے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے راشد نے پوچھا
آپ کو کتنی رقم درکار ہے؟
بیٹا اگر مجھے ایک لاکھ روپے ادھار دے دو تو میں جلدی لوٹا دونگا۔ سنا ہے تم حج پر جا رہے ہو کسی ضرورت مند کی مدد کرنا بہت بڑا فریضہ ہے باتیں کرتے ہوئے ماسٹر فیروز دین کی آواز تھرتھرانے لگی۔
انہوں نے اپنی سفید پگڑی کے ایک طرف لٹکتے ہوئے سرے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے راشد اور اس کی بیوی کی طرف ملتجانہ انداز سے دیکھا۔
ماسٹر صاحب کا لہجہ لجاجت بھرا تھا ان کے آنسو ان کی گالوں سے اترتے ہوئے داڑھی کے سفید بالوں کو چھو رہے تھے۔
انہوں نے اپنا عصا ایک طرف رکھ دیا۔ اور اپنے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے صوفہ سیٹ کا سہارا لیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے پھر راشد اور اس کی بیوی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر التجا کرنے لگے۔ ان کے ہاتھ کانپنے لگے وہ دل شکستہ انداز میں کہہ رہے تھے۔
بیٹا خدا اور رسولؐ کا واسطہ ہے مجھے مایوس نہ لوٹانا میری عزت کا سوال ہے۔
انہوں نے اپنی داڑھی کے بالوں کو چھوتے ہوئے کہا ان سفید بالوں کی لاج رکھ لو۔ یوں سمجھ لو تمہارا باپ تمہارے سامنے ہاتھ جوڑے ہوئے التجا کر رہا ہے۔
خدا اور رسولؐ کی قسم کھا کر کہتا ہوں میں یہ رقم ایک سال کے اندر لوٹا دوں گا۔ راشد کا دل خوف خدا سے تیز تیز دھڑکنے لگا۔
اُس نے پاسپورٹ اور ضروری کاغذات الماری کے اندر رکھتے ہوئے وہاں سے ایک لاکھ روپے نکال کر ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں تھما دیے۔
بیگم اس کی طرف کنکھیوں دیکھ رہی تھی وہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا شہروز بڑا ہو جائے تو اگلے سال اکٹھے حج پر چلیں گے۔

☆☆☆☆☆

ایک اچھے شہری کی موت

محمد یحییٰ [اومان]
مترجم: محمد افتخار شفیع

اچھا خاصا صحت مند آدمی تھا، گذشتہ رات چہرے سے خاصا پُرسکون دکھائی دے رہا تھا، حسبِ معمول اہلِ خانہ سے ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتا رہا اور پھر سو گیا۔ جب صبح ہوئی تو بستر سے اٹھ نہ سکا، گھر والوں نے آ کر جگانے کی کوشش کی لیکن وہ بالکل بے حس وحرکت ہو چکا تھا۔ تب جا کر اندازہ ہوا کہ یہ تو ابدی نیند سو چکا ہے۔ چاشت کے وقت تک اس کی موت کی خبر پورے شہر میں پھیل چکی تھی۔ اُن سب نے مل کر اسے غسل دیا، کفن دے کر خوشبو لگائی اور تدفین کے لیے اس کا تابوت لے کر قبرستان کی طرف چل پڑے۔ سب نے مِل کر اسے دفن کیا اور روتے بسورتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔

جب رات ہوئی تو اس نے قبر میں جھرجھری سی لی اور ایک دفعہ پھر زندہ ہو گیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی، چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ اُس نے گھبرا کر اپنے بدن کو کفن سے نجات دلائی اور اپنی قبر سے باہر نکل آیا۔ اب اس کا رخ قبرستان کے قریب ہی موجود شہری آبادی کی طرف تھا۔ اس نے

چلتے چلتے اپنے وجود پر نظر ڈالی تو یکدم چونک سا گیا، وہ بالکل مادرزاد برہنہ تھا، جیسے ابھی اپنی ماں کے شکم سے پیدا ہوا ہے۔ وہ بڑے آرام سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا گھر پہنچا اور اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔ صبح ہوئی تو آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ غسل خانے میں ٹھنڈے پانی کی دو بالٹیاں رکھی تھیں، اس نے جلدی سے انھیں اپنے بدن پر انڈیل لیا۔ آج بڑے اہتمام سے اس نے سفید لباس پہنا اور سر پر عربوں والا مخصوص سرخ دھاری دار سکارف رکھ کے اس پر سبز رنگ کی گول پٹی جما دی۔

وہ روزانہ کے معمول کے مطابق آج بھی صبح سویرے ہی تیار ہو گیا تھا۔ اس نے ہلکا پھلکا سا ناشتہ کیا اور شہر کی بڑی شاہراہ کے بارونق چوک کی طرف چل دیا، اسے دفتر کی طرف جانے والی کمپنی کی بس کا انتظار کرنا تھا۔ بس اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق آن کر رکی تو وہ اس پر سوار ہو گیا۔ بس میں تقریباً تمام ملازمین ہی سوار تھے، زیادہ تر اپنی اپنی سیٹوں پر اونگھ رہے تھے۔ کچھ لوگوں کے خراٹوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اس کی سیٹ کھڑکی کے پاس تھی، وہ آرام سے جا کر اس پر ٹک گیا۔ باہر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا اس کے وجود سے ٹکرائی تو اس پر بھی غنودگی سی طاری ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد بس نے کمپنی کے دفتر کے صدر دروازے پر پہنچ کر بریک لگائی۔ بس میں سوار لوگ ایک ایک کر کے نیچے اترنے لگے۔ بس ڈرائیور نے دیکھا کہ تمام لوگ بس سے اتر گئے ہیں لیکن ایک کاہل آدمی ابھی تک سیٹ سے ٹیک لگائے ہوئے خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا ہے۔ اس نے قریب جا کر اسے جگانے کے لیے آواز دی لیکن اس کی کوشش بے سود گئی۔ اس نے آہستگی سے اس کا کندھا ہلایا لیکن یہ جان کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا کہ بس پر بیٹھا آدمی مر چکا تھا۔ دوسرے ملازمین اردگرد جمع ہو گئے۔ سب نے مل کر اس کی لاش کو بس سے اتارا، اسے اندر لے گئے اور نہلا دھلا کر خوشبو لگائی۔ نمازِ جنازہ پڑھنے کے بعد اس کا تابوت اٹھا کر قبرستان کی طرف چل پڑے، انھوں نے مل کر اس کی تدفین کی اور ایک دفعہ پھر گھر کو لوٹ گئے۔

مرنے والا اصل میں بڑا کایاں شخص تھا، اس نے جان لیا تھا کہ اس کا پہلی دفعہ مرنا ایک سنگین غلطی تھی۔ ایک اچھے شہری کو دفتری امور کی انجام دہی کے دوران ہی موت آنی چاہیے۔

☆☆☆☆☆

بے مایہ

وسیم جبران

جب جوش کا طوفان تھما، غم و غصے کی لہریں اعتدال پر آئیں تو مجھے احساس ہوا کہ میں غلطی کر بیٹھا ہوں۔ مگر اب پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں کئی گھنٹوں سے اپنے بیڈروم میں بیٹھا تھا۔ ایش ٹرے بجھے ہوئے سگریٹوں سے اور کمرہ دھوئیں سے بھر چکا تھا۔ باس کو کھری کھری سناتے ہوئے مجھے انگریزی کا وہ مشہور مقولہ بالکل یاد نہیں آیا تھا جس کا مطلب ہے کہ باس ہمیشہ ٹھیک ہوتا ہے۔

شاید غلطی میری ہی تھی۔ کمپنی کے اکاؤنٹس کے معاملات دیکھنا یقیناً میرے فرائض میں شامل تھا لیکن باس کو کمپنی دینا اضافی تھا وہ بھی ایسے کہ باس کے ''پینے'' کا اہتمام بھی کیا جائے۔ اب ایسے میں کئی ایسے راز بھی مجھ تک پہنچ گئے تھے جو باس کے مطابق پوشیدہ رہنے چاہئیں تھے۔ اس کے باوجود باس کی طرف سے کسی انتہائی اقدام کی توقع نہیں تھی لیکن کچھ دنوں سے میں باس کی سیکرٹری کی نظروں میں کھٹکنے لگا تھا۔ طوفان اس وقت آیا جب باس کی بیوی کی آفس میں دھواں دار آمد ہوئی۔ آفس میں جو شعلے بھڑکے اس کی آنچ باہر تک محسوس ہو رہی

تھی۔ باس کی بیوی تو آنکھوں اور زبان سے آگ برساتی چلی گئی مگر اس کے فوراً بعد سیکرٹری نے باس سے ون ٹو ون ملاقات میں نہ جانے کیسے اس آگ میں اتنا پٹرول ڈالا کہ باس آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے۔

مجھے فوراً آفس میں بلایا گیا اور سارا الزام میرے سر ڈال دیا گیا۔ پرشباب سیکرٹری باس کے سینے سے لگ کر ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ باس کی بری بھلی باتوں پر میرا خون کھول اٹھا، میں نے اسی وقت استعفیٰ لکھ کر باس کی ٹیبل پر رکھا اور باہر نکل آیا۔

مجھے یہ نوکری بڑی مشکل سے ملی تھی۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ پھر سے نوکری کی تلاش میں نکلنا ہوگا۔ اگلے دن میں حساب کتاب کے لیے دفتر گیا تو پتا چلا کہ باس نے میرا استعفیٰ نامنظور کرتے ہوئے مجھے ٹرمینیٹ کر دیا تھا اور میری تنخواہ بھی ضبط کر لی تھی۔

پرائیویٹ نوکری تھی مجھے باس سے یہی توقع تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ میں بچت کا عادی نہیں تھا۔ لہٰذا اب میرے لیے گزر اوقات کرنا بہت مشکل ہو چکا تھا۔

میرے پاس کار تو تھی لیکن اب پٹرول کے لیے پیسے نکالنا بھی بہت مشکل تھا۔ جیسے تیسے روزانہ باہر نکلتا اور شہر بھر میں نوکری ڈھونڈتا مگر ہر جگہ سے انکار ہی سننے کو ملتا۔

میرا گھر ایک عام سے علاقے میں تھا جہاں مڈل کلاس اور لوئر مڈل کلاس لوگ ہی رہتے تھے۔ ایک دن پھر میں نئے عزم کے ساتھ تیار ہوا۔ گاڑی سٹارٹ کی پٹرول کی سوئی دیکھی پھر اخبار میں نشان زد کیے ہوئے کمپنی کے پتے کو دیکھا۔ دور جانا تھا اور پٹرول کم تھا۔ میں نے والٹ کھول کر پیسے دیکھے۔

سوچا کہ پیٹرول ضروری ہے شام کے کھانے کا بعد میں سوچوں گا کہ کیا کرنا ہے۔ گاڑی باہر نکالی ہی تھی کہ سڑک کے کنارے ایک لڑکی دکھائی دی۔ وہ رکشے والے سے کوئی بات کر رہی تھی۔ شاید بات نہیں بنی اس نے ہاتھ ہلایا اور رکشے والا چلا گیا۔ اتنی دیر میں میری کار اس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ میں نے کئی بار اس لڑکی کو آتے جاتے دیکھا تھا۔ وہ میرے گھر کے آس پاس ہی کہیں رہتی تھی۔

کار کی رفتار انتہائی کم تھی۔ لڑکی نے میری طرف دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اسے لفٹ کی ضرورت ہے۔ بلا ارادہ ہی پاؤں بریک پر آ گیا۔ لڑکی دو قدم آگے بڑھی پھر رک گئی گویا فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔

”شاید آپ کو کہیں جانا ہے۔ میں واپڈا ٹاؤن جا رہا ہوں۔ اگر لفٹ چاہیے تو آ جائیے۔“

لڑکی نے دو تین سیکنڈ کا توقف کیا پھر بولی

''مجھے ماڈل ٹاؤن جانا ہے، آپ کے راستے میں ہی آئے گا۔''

''تو پھر کیا سوچ رہی ہیں۔ بیٹھ جایئے۔''

میں نے بیٹھے بیٹھے فرنٹ ڈور کھولا اور وہ بیٹھ گئی۔ میں نے کار آگے بڑھا دی۔

''آپ مجھے جانتی ہیں ناں، میں یہیں رہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''جی جی! میں آپ ہی کے محلے میں رہتی ہوں لیکن آپ محلے داروں سے ملتے جلتے نہیں ہیں اس لیے شاید آپ کو میرے بارے میں علم نہیں ہے''

بات تو اس کی ٹھیک تھی دراصل میں اکیلا تھا نہ ماں باپ نہ بیوی بچے۔ میں دفتر سے آنے کے بعد عموماً گھر میں ہی رہتا تھا۔ باہر نکلتا تو دوستوں کی طرف چلا جاتا۔ محلے داروں سے جان پہچان کا تو قائل ہی نہ تھا یوں بھی مجھے یہاں منتقل ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ دراصل کار میری ضرورت تھی، موٹر سائیکل میرے نزدیک فضول سواری ہے۔ پرانے گھر میں گیراج نہیں تھا اور میری پرانی کار باہر گلی میں ہی کھڑی ہوتی تھی۔ چناں چہ جیسے ہی تنخواہ میں اضافہ ہوا تو میں نے یہ گھر کرائے پر لیا تھا کیوں کہ اس میں گیراج کی سہولت تھی۔

اُس سے زیادہ بات نہیں ہو سکی کیوں کہ میں اپنی پریشانی میں مبتلا تھا۔ اسے ڈراپ کرنے کے بعد میں واپڈا ٹاؤن کی اس کمپنی کے دفتر میں پہنچا جہاں مجھے انٹرویو دینا تھا۔ حسب سابق یہ انٹرویو بھی ناکام رہا تاہم ایک فائدہ ہو گیا کہ مجھے واپسی پر ایک دوست مل گیا اور میں نے اس سے کچھ رقم ادھار لے لی تاکہ پندرہ بیس دن نکالے جا سکیں۔

واپسی پر میں سوچ رہا تھا کہ اب ادھار کی نوبت آ گئی ہے جب تک نوکری نہیں ملتی کوئی غیر ضروری خرچ نہیں ہونا چاہیے۔ نوکری ڈھونڈنے کے لیے بھی پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرنی چاہیے۔

رات کو اخبار اچھی طرح کھنگال کر میں نے دو جگہ نشان لگائے جہاں نوکری ملنے کا امکان تھا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ جو بھی نوکری ملی قبول کر لوں گا خواہ معمولی ہو بعد میں بہتر بھی تلاش کی جا سکتی ہے یہ اور بات ہے کہ ابھی تک معمولی بھی نہ ملی تھی۔

اگلی صبح میں تیار ہو کر باہر نکلا۔ آج گاڑی نہیں نکالی تھی۔ پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرتے ہوئے نشان زدہ جگہوں پر جا کر انٹرویو دیئے ایک جگہ سے تو صاف جواب مل گیا دوسری جگہ سے یہ نوید سنائی گئی کہ دو دن بعد مطلع کیا جائے گا۔ خیر اس امید پر کافی خوشی ہوئی۔ کچھ وقت ایک پارک میں سوچ بچار کرتے ہوئے گزارا۔ اب شام ہونے والی تھی چناں چہ

واپسی کی راہ لی۔ ایک بس میں سوار ہوا اور گھر سے نزدیک ترین سٹاپ پر اترا۔ یہاں سے دو تین کلومیٹر کا فاصلہ تھا۔ پیدل ہی روانہ ہوا۔ ایک سٹاپ پر وہی لڑکی رکشے وغیرہ کا انتظار کرتی دکھائی دی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے سادہ سا لباس پہنا ہوا تھا۔ چہرہ میک اپ سے عاری تھا لیکن اس کے باوجود بڑی دل کش لگ رہی تھی۔ اس کی عمر بیس برس کے قریب رہی ہو گی۔ میں قریب پہنچا تو اس نے کسی قدر حیرت سے مجھے دیکھا۔

''شاید آپ رکشہ وغیرہ دیکھ رہی ہیں'' میں نے یونہی رکتے ہوئے کہا۔

''رکشے والے تو بہت پیسے مانگتے ہیں میں تو ویگن کا انتظار کر رہی ہوں لیکن آپ گاڑی کے بغیر کیوں؟''

''بس میں نے سوچا کہ پیدل چلنا صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ یہاں سے دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہی تو گھر ہے اس لیے پیدل ہی جا رہا ہوں۔''

''اوہ! اگر آپ برا نہ مانیں تو میں بھی آپ کے ساتھ ہی چلتی ہوں۔ ویگن نہ جانے کب ملے گی۔''

''آیئے! مجھے تو کوئی اعتراض نہیں'' میں نے قدم بڑھائے۔ وہ بھی ساتھ چل پڑی۔

''ویسے آپ کا گھر کون سا ہے؟'' میں نے یونہی سوال کیا۔

''وہی جو گلی کے آخر میں خستہ سا مکان ہے'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''اچھا! آپ پڑھتی ہیں یا کہیں نوکری کرتی ہیں؟''

''پڑھنے کا شوق تو بہت ہے مگر پڑھ نہیں سکی۔ تھرڈ ائر کا امتحان بھی نہیں دے سکی تھی۔''

''جب اتنا شوق ہے تو امتحان کیوں نہیں دیا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھنویں اچکائیں۔

''امتحان سے پہلے ہی میرے بابا پر فالج کا اٹیک ہو گیا تھا۔ ان کا کام بھی چھوٹ گیا اور جمع پونجی ان کے علاج پر لگ گئی۔ یہ امتحان کیا کم تھا'' وہ بولی۔

''اوہ! یہ سن کر افسوس ہوا۔ اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟''

''بس زندہ ہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''گھر میں کمانے والا اور کوئی نہیں؟''

''ماں نے تو کبھی سکول کی شکل تک نہیں دیکھی اور جب سے ابا بیمار ہوئے ہیں گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ ان کی تیمارداری میں چوبیس گھنٹے مصروف رہتی ہیں۔ بھائی کوئی ہے نہیں۔ چھوٹی بہن بھی آٹھویں سے آگے پڑھ نہیں سکی۔''

''سوری! میں نے آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں''

''چھوڑیئے صاحب! نام میں کیا رکھا

ہے؟'' اس نے دھیرے سے سر جھٹکا۔
''میں سمجھ سکتا ہوں، ایسے میں گزر اوقات کس قدر مشکل ہے'' میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔
''میں آپ کو کیا بتاؤں۔ کتنا مشکل ہے۔ مجھے جو چھوٹا موٹا کام ملتا ہے، میں کر لیتی ہوں۔ کسی گھر میں صفائی کر دی، کپڑے دھو دیے، برتن مانجھ دیے لیکن اتنے پیسے نہیں ملتے کہ گھر کا خرچ چل سکے۔''
''واقعی بہت مشکل ہے۔ تم کم از کم گریجویشن کر لو تو کوئی بہتر کام مل سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ لڑکی عجیب سے انداز میں مسکرائی تو مجھے اپنا خیال آ گیا۔ میں بھی کتنے دنوں سے خوار ہو رہا تھا اور کام نہیں ملا تھا۔
''ابھی کیا تم کام سے آ رہی ہو؟''
''کہاں صاحب! میں جس کوٹھی میں کام کرتی تھی۔ مالکن نے مجھے کام سے نکال دیا ہے۔ کچھ دنوں سے میں کام ڈھونڈ رہی ہوں۔'' وہ بولی۔
''اچھا! خیر کوشش جاری رکھو۔ کام مل ہی جائے گا۔'' میں نے تسلی دی۔
''اگر آپ کو ضرورت ہو تو میں آپ کے گھر بھی کام کر سکتی ہوں''
''نہیں نہیں! میرا تو اتنا کام ہوتا ہی نہیں۔ جو ہوتا ہے وہ میں خود ہی کر لیتا ہوں'' میں نے فوراً نفی میں جواب دیا۔
''اچھا اچھا'' لڑکی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
اب ہم چلتے چلتے اپنے محلے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ شام کا ملگجا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ کہیں کہیں سٹریٹ لائٹس روشن ہونے لگی تھیں۔ میرا گھر پہلے آتا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں ذرا سا رکا۔
''میرا گھر آ گیا۔'' میں نے جیسے اطلاع دی۔ لڑکی بھی رک گئی جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ میں اس کے دل کش چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔
''مجھے آپ سے ایک بات کہنی تھی'' وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔
''ہاں ہاں کہو کیا بات ہے''
''چلیں پھر سہی'' اس نے قدم آگے بڑھا دیے۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ رکی اور مڑ کر مجھے دیکھا۔ پھر ایک ایک قدم اٹھاتے ہوئے میری طرف بڑھی۔
''پوچھو ناں تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہو؟'' میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک بار دائیں بائیں دیکھا۔ گلی میں اس وقت کوئی نہ تھا۔ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔
''کوئی کام ہو تو بتایئے صاحب؟''
میری نگاہیں جھکتی چلی گئیں۔

☆☆☆☆☆

خواب کہانیاں

نجیب محفوظ
مترجم: حمزہ حسن شیخ

(۱)

میں دریائے نیل کے سرسبز کناروں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ رات نم تھی جیسے دریا کے پانی اور چاند کے درمیان ایک خفیہ مکالمہ جاری ہو، جس پر جگمگاتی کرنیں ہلکورے کھا رہی تھیں - میری روح عباسیہ کے نہاں خانوں میں بھٹک رہی تھی، جس پر محبت اور یاسمین کی خوشبو چھائی ہوئی تھی۔

میں نے خود کو ایک سوال کے ساتھ مکالمہ کرتے پایا جو وقتاً فوقتاً مجھے پریشان کرتا رہتا تھا کہ وہ ایک بار بھی میرے خواب میں نہ آئی تھی۔ جب سے اس کی وفات ہوئی تھی، کم از کم ایک بار بھی نہیں صرف اس بات کی یقین دہانی کے لیے کہ وہ حقیقت تھی نہ کہ صرف ایک الھڑ جوان خوبصورت سا تخیل---؟ کیا اس کی وہ تصویر جو میرے ذہن پر ثبت ہو چکی تھی، واقعی ایک حقیقی چاہت تھی؟ پھر موسیقی کی جھنکارتی آواز کے ساتھ، جو کہ اندھیری گلی کی جانب سے آ رہی تھی، بھوت نمودار ہوئے۔ اُن کی شکلیں پیلے لیمپ کی روشنی میں واضح

ہوئیں۔ جس کی جانب وہ بڑھ رہے تھے۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ پیٹل کا فیتہ میرے لیے اجنبی نہ تھا، میں کئی بار ان کو اپنی جوانی میں سُن چکا تھا جیسا کہ جنازوں کے انتظار میں پیش قدمی کرتے تھے۔ اس دُھن کو میں دل سے پہچانتا تھا۔

لیکن خوشی کی بات یہ تھی کہ میں نے اپنی بچھڑی ہوئی محبوبہ کو دیکھ لیا جو اس موسیقار کے پیچھے چل رہی تھی۔ یہ یقیناً وہی تھی، اپنے دل موہ لینے والے روپ میں۔ اس کے پُرجلال قدم اور اپنے شاندار چہرے کے ساتھ۔ آخرکار اُس نے مجھے اپنے دیدار کا شرف بخشا۔ جنازے کے جلوس کو چھوڑ کر، وہ میرے سامنے کھڑی ہوگئی، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ساری زندگی ضائع نہیں ہوئی تھی۔ بغیر سانس لیے بالکل سیدھا کھڑے ہوئے، میں اپنی روح کی ساری طاقت کے ساتھ اس کی جانب بڑھا، اپنے آپ سے یہ کہتے ہوئے کہ یہی موقع ہے اپنے دل کی محبوبہ کو چھونے کے لیے اور ایسا موقع دوبارہ نہیں آئے گا۔

اُس کی جانب ایک قدم اُٹھاتے ہوئے، میں نے اُسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ تب میں نے کچھ چٹکنے کی آواز سُنی جیسے کچھ ٹوٹا ہو۔ اس کا لباس ایسے محسوس ہوا جیسے یہ کسی خالی خلا کے اوپر لپٹا ہوا اور جیسے ہی مجھے معلوم ہوا۔ تب ہی وہ شاندار سرزمین پر گرا اور لڑھکتا ہوا دریا میں گم ہوگیا۔ لہروں نے اس کا ایسے خیر مقدم کیا جیسے وہ دریائے نیل کا گلاب ہو لیکن وہ مجھے ایک دائمی غم دے گیا۔

---

(۲)

میں گلی میں ٹہل رہا تھا۔ میں اچھی طرح اس جگہ سے واقف تھا کیوں کہ یہی وہ جگہ تھی جہاں میں نے کام کیا تھا اور جہاں کھیلا تھا، جہاں میں اپنے دوستوں اور محبوباؤں سے ملا تھا یہ جانتے ہوئے کہ ایک شخص میرے سامنے سے گذر رہا تھا جو نہ زیادہ قریب تھا اور نہ زیادہ دُور تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ، وہ یہ یقین دہانی کرنے کے لیے صرف مُڑا کہ میں اس کے پیچھے تھا۔ شاید ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ میں نے اسے دیکھا تھا لیکن یقیناً ہمارے درمیان کوئی باہمی رابطہ یا رشتہ نہ تھا۔ جو کچھ وہ کر رہا تھا، وہ میرے لیے پریشان کن تھا اور اس نے مجھے دعوتِ مبارزت پیش کی تھی۔ میں نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کردی اور اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ مجھے افسوس ہوا جیسے وہ کچھ سوچ رہا تھا اور اس نے مجھے مزید پریشان کردیا۔ اسی وقت مجھے

ایک دوست نے کچھ کاروباری معاملات پر گفتگو کرنے کے لیے آواز دی اور میں اس کی دکان کی جانب بڑھ گیا اور اس کے ساتھ محوِ گفتگو ہو گیا اور مجھے اس شخص کا خیال جاتا رہا۔

جب بعداز دوپہر ہمارا کام ختم ہوا تو میں نے اپنے دوست کو خدا حافظ کہا۔ جیسے ہی میں نے اپنے گھر کی جانب راہ لی تو مجھے اس شخص کی یاد آئی اور میں نے پیچھے مڑ کر اُس کو دیکھا۔ وہ پھر میرا تعاقب کر رہا تھا جیسے کہ پہلے میں نے اُس کو اپنے آگے چلتے ہوئے محسوس کیا تھا۔۔۔ غصے میں آ کر۔۔۔ میں نے رُکنے کا فیصلہ کیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کیا کر رہا تھا لیکن اس کے بجائے میں نے اپنے قدموں میں تیزی محسوس کی جیسے کہ میں اُس سے دُور بھاگنا چاہتا ہوں۔ میں حیران و پریشان تھا کہ وہ چاہتا کیا ہے؟

جب مجھے اپنا گھر نظر آنے لگا تو مجھے سکون محسوس ہوا جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا اور میں بغیر پیچھے مڑے یا دیکھے گھر میں داخل ہو گیا۔ گھر کو خالی پاتے ہوئے میں اپنے سونے کے کمرے کی جانب بڑھا اور پھر میں ٹھٹھر کر رہ گیا کہ وہ آدمی دبے پاؤں اندر گھوم رہا تھا۔

---

(۳)

اسسٹنٹ ڈاکٹر نے کامیاب آپریشن پر مجھے مبارک باد دی۔ نشہ ختم ہونے کے بعد جب میں اُٹھا تو مجھے اپنی نئی زندگی پر خوشی اور سکون محسوس ہوا۔ مجھے دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

جب ایک نرس آئی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ اپنا سر میرے قریب لے آئی۔ خاصی دیر سوچ میں ڈوبی ہوئی وہ مجھے گھورتی رہی اور پھر ٹھہرے ہوئے پُرسکون لہجے میں بولی، ''میں کب سے تمھیں اس طرح بے یار ومددگار اور بیمار لیٹے ہوئے دیکھنے کا انتظار کر رہی تھی۔''

میں نے دوبارہ اُس کی جانب دیکھا اور مایوسی سے کہا، ''لیکن یہ پہلی دفعہ ہے کہ میں نے زندگی میں آپ کو دیکھا ہے۔۔۔ آپ مجھے کوئی تکلیف کیوں دینا چاہیں گی؟''

وہ شائستہ اور پرسکون لہجے میں جواب دینے لگی، ''انتقام کا وقت آ گیا ہے۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے سے نکل گئی جبکہ میں پریشانی، خوف اور بے چینی کے بھنور میں گھر گیا۔ یہ عورت کیسے تصور کر سکتی ہے کہ میں نے کبھی اُسے اذیت پہنچائی ہے، جب کہ میں نے آج سے پہلے اُسے کبھی دیکھا تک نہیں۔''

ڈاکٹر میرا معائنہ کرنے کے لیے واپس

آ گیا تھا۔ میں اُس سے چمٹ گیا اور کہنے لگا۔
''ڈاکٹر پلیز، میری زندگی خطرے میں ہے۔''
اُس نے سب کچھ سُنا جو میں نے اُس سے بولا۔ اُس نے وارڈ میں کام کرنے والی ساری نرسوں کو حکم دیا کہ وہ میرے سامنے ایک قطار میں کھڑی ہو جائیں لیکن وہ جس کی مجھے تلاش تھی، وہ اِن میں نہ تھی۔ جیسے ہی وہ چلی گئیں، ڈاکٹر نے مجھے یقین دلایا، ''آپ یہاں پر ہماری مکمل حفاظت میں ہیں۔''
لیکن اُس دہشت ناک عفریت نے مجھے معاف نہ کیا۔ جو کوئی بھی کمرے میں داخل ہوا، اُس نے عجیب و غریب نظروں سے مجھے گھورا۔ جیسا کہ میں حیران اور شک کی کوئی چیز ہوں جبکہ میں نے دیکھا کہ میرے سامنے مشکلات سے بھرپور ایک لمبی سڑک تھی۔

---

(۴)

نیا کمرہ دیکھنے کے بعد میری آنکھیں چندھیا گئیں تھیں جو کچھ دیر پہلے ہی مجھے ملا تھا۔ میں نے ہر کونے کا معائنہ کیا اور اس نے میری روح کو خوشی سے سرشار کر دیا۔ ''اب تمھیں ایک باقاعدہ ملازمت کی ضرورت ہے۔'' میں نے خود کو بتایا۔ ''تمھیں بغیر کسی تاخیر کے فیصلہ کرنا چاہیے۔''
میں مارکیٹ گیا جو ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی، ایک خوف ناک دیوار سے گھری ہوئی تھی۔ میں نے فلیٹ کے لیے اپنی ملکیت کا ارادہ ظاہر کیا اور انھوں نے مجھے اندر بلا لیا۔
وہ جگہ لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے وہاں کئی عورتوں کو دیکھا جن کے ساتھ ماضی میں، مَیں محبت کر چکا تھا لیکن وہ سب بازوؤں میں بازو لیے اپنے مردوں کے ساتھ چل رہی تھیں۔ میں متعلقہ کھڑکی کی جانب بڑھا اور اپنے کاغذات پیش کیے جو نئے فلیٹ کے لیے میری ملکیت کا پہلا ثبوت تھا۔ آدمی نے اُن کاغذات کو دیکھا اور مجھے بتایا، ''تمھارے پاس فی الوقت کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہم مناسب وقت پہ آپ سے رابطہ کریں گے۔''
مجھے اپنی اُمیدیں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں کہ مجھے کافی عرصے تک انتظار کرنا پڑے گا۔ میں بھیڑ کو چیر کر اپنا راستہ بناتا ہوا پلٹا، اُن دل کش اور جگمگاتے چہروں کا تصور کرتے ہوئے جن سے میں نے محبت کی تھی۔ میں نے اکیلے ہی اُس فلیٹ میں آرام کیا جبکہ گلی میں، مَیں نے ایک شخص کو اونچی آواز میں یہ کہتے سُنا، ''یہ ایک آدمی کے لیے حماقت ہے کہ وہ نوکری نہ کرتے ہوئے ایک فلیٹ خریدے۔ اُسے یہ کسی اور خوش نصیب کے لیے چھوڑ دینا چاہیے، جس کی نوکری پکی

ہو چکی ہو۔"

جو کچھ اُس نے کہا، اُس نے مجھے پریشان کر دیا اور جتنی دیر میں نے اس کے بارے میں سوچا مجھے یہ سچ ہی لگا۔

پریشانی اور شک کے اس شدید حملے کے بعد، میں نے اپنی پریشان اور نیند سے عاری آنکھوں کے ساتھ دیکھا کہ کل کے پیچھے کیا چُھپا ہوا ہے۔

---

(۵)

یہاں پر ائر پورٹ تھا، اس کا ماحول آوازوں اور زبانوں سے گونجتا رہتا۔ عورتیں جو اپنے سارے کاغذات چیک کروانے کے بعد، کھڑی انتظار کر رہی تھیں۔ میں اُن کے قریب آیا اور ہر ایک کو چاندی کے کاغذ میں لپٹا گلاب کا ایک پھول پیش کیا۔

"باحفاظت سفر فرمائیں - - - آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔" میں نے کہا۔

انھوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور اُن میں سے ایک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ بہت ہی جفاکش مشن ہے اور اس کی کامیابی کے لیے کئی سال درکار ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ اس کا کیا مطلب تھا اور درد نے میرے دل کو جکڑ لیا۔ ہم نے خاموش الوداعی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا، جس طرح پرانا زمانہ ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہو۔ جہاز نے حرکت کی، میری نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا یہاں تک کہ اُس کا پیکر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جب میں استقبالیہ ڈیسک کی جانب واپس آیا، جو کچھ مجھے یاد تھا، وہ صرف یہ خواہش تھی کہ مجھے پوسٹ آفس تلاش کرنا تھا۔

یہ ایسے ہی تھا جیسے کہ میں صرف یہی مقصد لے کر آیا تھا۔ میں نے ایک سرگوشی سُنی، "کیا آپ ڈاکخانے جانا چاہتے ہیں؟"

میں حیران ہوا اور اس جانب نظریں دوڑائیں تو ایک لڑکی کو پایا جس کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون تھی؟

"میں رابیہ کی بیٹی ہوں۔ شاید آپ کو رابیہ اور سکینہ یاد ہوں؟"

تذبذب کے عالم میں، مَیں نے جواب دیا، "یادوں سے مجھے خوف آتا ہے۔"

"اگر آپ ڈاکخانے جانا چاہتے ہیں،" تو میرے پیچھے آیئے۔" اُس نے نصیحت کی۔

تاہم، شدید خوف اور پریشانی کے باوجود، میں نے ایسا ہی کیا جیسا اس نے کہا تھا۔

☆☆☆☆☆

دیارِ عشق

۱۶۲ نمبر رائفل اس کے نام پر روزانہ کوت (وہ کمرہ جہاں پر فوجی ہتھیار زمانۂ امن میں سلیقے سے رکھے جاتے ہیں) سے جاری ہوتی تھی اور وہ اسے دن بھر اپنے ہاتھوں میں لیے، دور دشمن کی پوسٹوں پر نظر جمائے رکھتا تھا کہ کب اس کے افسرانِ بالا کی طرف سے گولی چلانے کا حکم ملے اور وہ اس رائفل کی بیرل ان پوسٹوں پر تھان کر گولیوں کی بوچھاڑ کر دے۔ سپاہی گل شیر اپنی پلٹن کا ایک اچھوتا سپاہی تھا، وہ سب سے الگ رہنے کا عادی تھا۔ سیاچن کی برف پوش پہاڑوں پر اسے ڈیوٹی دیتے ۸ ماہ کا عرصہ بیت گیا تھا، یہاں پر تنہائی اس کی رفیق تھی اور وہ ہمیشہ ایک ڈائری اور پین بغل میں دبائے یہاں وہاں گھومتا نظر آتا۔ وہ پوری پلٹن میں عاشق مزاج مشہور تھا، جب بھی فرصت ملتی وہ اپنی ڈائری اور پین لیے، کسی سنسان جگہ پر اپنی ڈائری کی ورق گردانی کرتا رہتا، یہی ڈائری کی سنگت اس کے عاشق مزاج ہونے کی چغلی کھاتی تھی۔ بسا اوقات اس کے ساتھی اس سے اس کی ڈائری چھیننے کی ناکام کوشش کرتے رہتے۔

دسمبر کی سرد شامیں اکثر ان برف پوش پہاڑوں پر بھاری اداسی لے کے آتی تھیں۔ لیکن وہ اس اداسی سے محظوظ ہوا کرتا تھا، اداسی اس کے لیے طاقت کا باعث ثابت ہوتی تھی۔ آج بھی وہ اپنی ۱۶۲ نمبر رائفل تھامے اپنے اِگلو (جو نپڑی نما کمرہ جو کہ اونچی برفانی پوسٹوں پر فوجیوں کی خواب گاہ ہوتی ہے) سے کچھ دور بیٹھا پنجابی گیتوں کے راگ الاپ رہا تھا کہ اتنے میں اس کے ایک ساتھی نے اسے دُور سے آواز دی، ''ابے او دل جلے عاشق، تجھے کچھ فرصت ہے اپنی ڈائری سے، دیکھو شام ہو چلی ہے، نیچے آ کے کھانا کھا لے۔'' لیکن اس نے اپنے ساتھی کی آواز ان سنی کر دی اور اسے چھیڑنے کے لیے گیت کو اور بھی زیادہ بلند آواز سے گانے لگا۔

''اِک پُھل موتیے دا مار کے جگا سوڑیے''

شام کے سائے ڈھل چکے تھے اور پھر وہی

آفتاب محمود شمس

بے قرار رات جو کہ گل شیر کے لیے ستاروں کی نمائش لاتی تھی۔ رات کو اس کو اپنی امی کے کہی ہوئی یہ بات بہت زور سے یاد آتی تھی کہ لوگ اس جہانِ فانی سے گزر جانے کے بعد آسمان میں تارہ بن جاتے ہیں، اسے خبر تھی کہ یہ محض اس کی والدہ اسے بہلانے کے لیے کہتی تھیں، لیکن وہ جیون کے ۲۸ بہاریں دیکھنے کے بعد، آج بھی جب آسمان کی طرف دیکھتا تو وہ ان تاروں میں اپنی آنجہانی والدہ کو تلاشتہ، کہ شاید ہی کہیں سے نمودار ہو کر وہ اس کو کہانی سنانے لگ جائیں۔ برف کی بوندیں خزاں رسیدہ پتوں کی طرح جھومتے ہوئے اس کے چہرے پر اتر رہی تھیں۔ یکایک اس نے اپنے فیلڈ جیکیٹ کی جیب سے اپنی ڈائری نکالی اور کافی دیر تک اس کی ورق گردانی کی، لیکن شعیب کو آتا دیکھ کر اس نے جھٹ سے اسے واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا۔

”ہاں ہاں، چھپا لے اس کو، نہیں چھینتا میں تم سے تمھاری ڈائری، مجھے کوئی شوق نہیں تمھاری محبت کی داستانیں پڑھنے کا، مجھے معلوم ہے کہ صبح یونٹ کا ڈی آر (Despatch Rider کی ابریویشن (Abbreviation) ہے، جس سے مراد وہ ڈاکیا ہے جو فوجی خطوط سگنل سنٹر اور سول ڈاکخانے تک پہنچانے کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہوتا ہے) ہیڈکوارٹر جا رہا ہے اور تم نے اپنی محبوبہ کے لیے کوئی نہ کوئی پروانہ ضرور تیار کیا ہوگا۔“ شعیب کی بات سن کر گل شیر کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے رائفل ہاتھ سے سہلاتے ہوئے اپنی جھولی سے اٹھا کر اپنی ہاتھوں میں عموداً تھام لی اور رہب دار لہجے میں بولا ”ہاں، پروانہ تو میں ہر مہینے لکھتا ہوں اپنی محبوبہ کو اور ان شاء اللہ جب تک زندہ ہوں، لکھتا رہوں گا۔“

شعیب کے چلے جانے کے بعد گل شیر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا، اسے اپنے گاؤں کے وہ سارے رستے یاد آنے لگے جن پر چل کر اس نے اپنا بچپن بتایا تھا۔ وہ تمام رشتے جن کے سنگ رہتے رہتے اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ اسے اپنے بابا کی قبر بھی یاد آئی، جس میں ایک فوجی دستے نے ان کی شہادت کے بعد سلامی دے کر انھیں سپرد خاک کیا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی والد کی شہادت کے بعد اس کی مرحومہ والدہ نے کس طرح اسے پالا پوسا

تھا اور اپنی جوانی اس کے ننھے وجود کی رکھوالی میں گزار دی تھی۔ پھر یک دم اس کی آنکھوں میں اس پری وش کی تصویر جھلملانے لگی، ہاں وہی تو تھی، وہی کومل صورت والی لاریب، جس پر وہ ہزار جان سے فریفتہ تھا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ وہ انہی خیالوں میں مگن تھا کہ اسے عرفان کی آواز سنائی دی۔ ''گل شیر تیری ڈیوٹی کا وقت ختم ہو گیا ہے، چلو اگلو میں جا کر آرام کرو، چار گھنٹے کے بعد تمھیں پھر تازہ دم ہو کر ڈیوٹی دینی ہے۔'' گل شیر جو کہ اپنے خیالوں میں مگن تھا اور اس اچانک آواز سے خاصا چونک گیا اور بے خبری میں اپنی رائفل کی بیرل سیدھا عرفان کے طرف تھان لی۔ ''اوہ تو ہے، میں تو ڈر ہی گیا تھا یار''، گل شیر نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ گل شیر نے اپنی گھڑی پر نگاہ دوڑائی تو رات کے ۱۲ بج چکے تھے اور اب اسے ٹھیک صبح کے ۴ بجے تازہ دم ہو کر دوبارہ ڈیوٹی سنبھالنی تھی۔

اگلو میں داخل ہوتے ہی اس کی آنکھیں چندیا گئیں۔ لالٹین کی دھیمی روشنی نے اس کا استقبال کیا، یہاں برفیلی پوسٹوں میں جوانوں کی آنکھیں برف کی وجہ سے خاصی حساس ہو جاتی ہیں کہ ہر طرف سفید رنگ دیکھنے کو ملتا ہے جس کی وجہ سے معمولی سی روشنی بھی آنکھوں میں سوئیوں کے طرح چبھن پیدا کرتی ہے۔ اس نے دھیرے سے اپنا بستر بند کھولا اور اپنے وجود کو برفانی رضائی کے حوالے کر دیا۔

نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، وہ بار بار اپنی آنکھیں میچ کر نیند کو دعوت دینے کی بے سود کوشش کرتا۔ کافی وقت بیت جانے کے بعد بھی جب نیند نہ آئی تو اس نے اپنی ڈائری دوبارہ نکالی اور اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اس کو شعیب کے ساتھ ہوئے اپنے مکالمے کی یاد آئی جب اس نے محبوبہ کے نام اپنے خط لکھنے کی بات کی تھی، وہ ہلکا سا زیرِ لب مسکرایا اور جیب سے پین نکال کر کچھ لکھنے میں محو ہو گیا۔ قلم روانی کے ساتھ قرطاس سے باتیں کر رہا تھا اور اس دوران گل شیر کے چہرے کے موسم بدلتے رہے۔ لالٹین سے نکلتے کالے دھویں نے روشنی کافی مدھم کر دی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنے آرام کرنے کے وہ ۴ گھنٹے بھی اپنی ڈائری سے باتیں کرنے میں بتا دیے۔ صبح کے ۴ بجنے میں آدھا گھنٹہ رہ گیا تھا، گل شیر نے اپنی ڈائری معمول کے مطابق اپنی

فیلڈ جیکیٹ کی جیب میں رکھ لی تھی، اور وہ لفافہ جس میں اس نے خط لکھنے کے بعد ڈالا تھا اپنی اوپری جیب میں علیحدہ رکھ لیا تا کہ صبح پہلی فرصت میں ہی اسے ڈی آر کے حوالے کر دے۔

گل شیر اگلو سے باہر نکلا تو سردی کی ایک لہر اس کے جسم وجاں کو چھیڑتی ہوئی گزر گئی، اس نے اپنے ہاتھوں، جو کہ مخصوص قسم کے دستانوں سے ڈھکے ہوئے تھے، ہوا میں لہراتے ہوئے شعیب کو، جو کہ عرفان کے دو گھنٹے کے ڈیوٹی دینے کے بعد ڈیوٹی پہ آیا تھا، اپنی جانب متوجہ کیا، ''شعیب صاحب آپ کی ڈیوٹی ختم ہوئی، براہ کرم نیچے اگلو میں تشریف لے آیئے''، اس نے شعیب کو چھیڑتے ہوئے باآواز بلند کہا۔ اس سے اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ دور دشمن کی چیک پوسٹ تک یہ خبر پہنچ جائے کہ ڈیوٹی پر گل شیر پھر آ گیا ہے لحاظہ انھیں بھی اب چوکنا ہو کر ڈیوٹی دینی پڑے گی۔

شعیب کے جانے کے بعد گل شیر حسبِ معمول پنجابی گیت گنگنانے لگا، اس نے اپنی جیب سے اپنی پسندیدہ برینڈ کی سگریٹ نکالی اور سلگا کر ہوا میں دھویں کے مرغولے بنانے میں مشغول ہو گیا۔ فضا میں ہواؤں کے سنسنانے سے ایک عجیب سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ وہ اپنی تنہائی سے کبھی بھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا بلکہ اسے تنہا رہنا پسند تھا جب ہی وہ اپنے افسرانِ بالا سے بذاتِ خود درخواست کر کے آبادیوں سے دور اس برفیلی پوسٹ پر ڈیوٹی دینے آیا تھا۔ یہاں پر اس کے علاوہ چار جوان اور بھی تھے جو اس کی عادات پر کافی حیران اور پریشان رہتے کیونکہ اکثر لوگ اس ویرانے میں آنے سے کتراتے تھے لیکن اس نے اپنی مرضی سے اس جگہ ڈیوٹی دینے کی حامی بھری تھی اور ان آٹھ ماہ میں اس نے کبھی بھی نیچے ہیڈ کوارٹر یا چھٹی جانے کی عرضی نہیں ڈالی تھی۔

سگریٹ کا آخری کش لگانے کے بعد اس کی نگاہ دور دشمن کی پوسٹوں پر جم گئی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ آیا دور بنی اس پوسٹ میں بھی کوئی گل شیر بیٹھا ڈیوٹی دے رہا ہو گا، کوئی ایسا گل شیر جو کہ کاغذ اور قلم سے محبت کرتا ہے، جو ان برف پوش پہاڑوں میں بھی 8 کتابوں پر مشتمل ایک چھوٹی سے لائبریری سے دل بہلاتا ہے---- گل شیر ابھی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک پوسٹ کی پچھلی دیوار پر گولی شوں کرتی ہوئی

پیوست ہوگئی۔ گل شیر اس اچانک حملے کی توقع بالکل بھی نہیں رکھتا تھا۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے حواس پر قابو پا لیا اور اپنی رائفل کی بیرل پوسٹ میں بنے سوراخ میں سے باہر نکال کر دشمن کی پوسٹ کی شست لیتے ہوئے ٹریگر پر انگلی دبا دی، مہینوں سے خاموش رائفل نے آگ اُگلی۔ گل شیر نے یکے بعد دیگرے کئی میگزینیں بدلیں اور دشمن کی پوسٹ پر قیامت برپا کر دی۔ گولیوں کی آواز سنتے ہی اس کے ساتھیوں نے بھی اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک فائرنگ کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج رہی تھی، رائفل کی بیرل سے دھواں نمودار ہو رہا تھا جو کہ گل شیر کے دل کو ایک عجیب سی خوشی سے دے رہا تھا اور وہ زیرِ لب مسکرایا--- لیکن یہ مسکراہٹ گل شیر کی زندگی کی آخری مسکراہٹ تھی کہ اگلے ہی لمحے ایک گولی اس کے سینے کے آر پار ہوگئی اور راتوں کو بھی اکثر بے کلی میں جاگنے والا گل شیر اپنے والد کی طرح شہادت کا جام پی کر ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گیا۔

صبح آٹھ بجے گل شیر کی میت کو سی ایم ایچ (Combined Military Hospital) منتقل کرنے کے لیے ہیلی کاپٹر پوسٹ کے صحن میں اتر چکا تھا۔ کمانڈنگ آفیسر سمیت یونٹ کے افسران، گل شیر کو کندھا دینے کے لیے آموجود تھے۔ جب دو سپاہی گلشیر کی میت کو ہیلی کاپٹر میں رکھنے لگے تو شعیب کو گل شیر کی ڈائری یاد آئی جس میں وہ ہر وقت اپنی محبوبہ کے لیے شاعری لکھتا رہتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شعیب کے فیلڈ جیکٹ کی جیب سے وہ ڈائری نکالی اور وہ خط بھی جو نے اس نے رات لکھا تھا۔ شعیب نے جب ڈائری کھولی تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی، ڈائری میں جابجا پاکستان کا پرچم بنا ہوا تھا اور ہر صفحے پر وطن سے محبت کے ترانے لکھے ہوئے تھے۔ یکا یک شعیب کو خیال آیا کہ اگر وہ ڈائری میں ملی نغمے لکھتا تھا تو وہ خطوط کس کے نام تھے جو وہ ہر ماہ باقاعدگی سے لکھا کرتا تھا۔ شعیب نے جلدی سے اس خون آلود لفافے پر نگاہ دوڑائی جو گل شیر کے اوپری جیب سے برآمد ہوا تھا۔ لفافہ جو کہ کسی مقامی اخبار کے ایڈیٹر کے نام تھا اس میں رکھے کاغذ پر "شہادت نامہ" کے عنوان سے یہ نظم درج تھی:-

☆☆☆☆☆

عورت ہوں نا

''عورت لفظ بظاہر جتنا چھوٹا ہے باطن میں بے پناہ ظرف کا حامل ہے۔ عورت ہونا گناہ نہیں لیکن عورت جنس ہی ایسی کہ اسے سب کچھ سہنا پڑتا ہے کیونکہ عورت ہے نا۔''

''اماں'' جو بھی ہے لیکن میں نے جو کہہ دیا بس میری بات وہی ہے۔

''ارے'' بیٹا تو ہماری بات کیوں نہیں سمجھ رہا۔ کیسے ہم اپنی رابعہ جو ایک کم سن بچی ہے اُس کو کسی بڑے شخص کے ساتھ بیاہ دیں.....

''اماں'' میری شادی ہیرا سے نہ ہوئی تو میں بھی نہیں رہوں گا۔ میں اپنی زندگی ختم کر دوں گا۔

کیسی باتیں کر رہے ہو ہمیں کس آزمائش میں ڈال رہے ہو تم ہمارے اکلوتے اور تین بہنوں کا سہارا ہو۔ وہ لوگ ہمارے والے نہیں۔

میں کچھ نہیں سمجھنا چاہتا جو کہہ دیا بس کہہ دیا۔ شاہ زیب غصہ سے بولا۔

شاہ زیب کے اماں اور ابا صدمے کے عالم میں تھے ایک طرف بیٹی اور دوسری طرف بیٹے کی زندگی تھی۔

اگلے ہی دن شاہ زیب کا رشتہ ہیرا کے گھر اس نیت سے اس کے اماں اور ابا لے کر گئے کہ اُن سے بات کریں گے کہ ہماری بیٹی آپ کے بیٹے سے بہت چھوٹی ہے۔ وہ ابھی ساتھویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ آپ کا بیٹا چھتیس سال کا ہے۔ ان کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔

ہیرا کے ابا نے صاف انکار کر دیا کہ اگر ہم اپنی بیٹی کا رشتہ دیں گے تو آپ بھی اپنی بیٹی کا رشتہ دیں گے۔ ہیرا کا بھائی علت میں مبتلا انسان تھا جسے کسی نے بھی اپنی بیٹی دینا پسند نہیں کی۔ اسی لیے انہوں نے یہ ڈیمانڈ رکھی تھی کہ شیراز کا کہیں رشتہ نہیں ہونا۔

''شاہ زیب'' کی زندگی کے لیے اس کے اماں ابا نے رابعہ کا رشتہ شیراز سے کر دیا۔ رابعہ اور شاہ زیب دونوں کی شادی ہوگئی۔

''رابعہ'' کو شیراز کے ساتھ دوسرے شہر میں رہنا پڑا جدھر وہ کام کرتا تھا۔ رابعہ کمرے کی حالت پہلے دن دیکھ کر حیرت میں مبتلا ہوگئی

کومل شہزادی

کہ وہ کیسی جگہ آ گئی ہے جدھر شراب کی بوتلیں اور طرح طرح کی عجیب چیزیں پڑیں تھیں۔ رابعہ عورت تھی اس وجہ سے اُس پر روز تشدد ہونا اور کام کرنا تقریباً ایسے چلتا رہا۔

کچھ ماہ بعد اچانک ''شاہ زیب'' اور ''ہیرا'' کی لڑائی شروع ہوگئی وہ چیخ چیخ کر اُسے کہہ رہی تھی کہ میں تمہارے ساتھ نہیں رہنا مجھے گھٹن محسوس ہوتی ہے۔

''شاہ زیب'' شادی سے پہلے بھی میں ہی تھا لیکن اب کیا ہوا۔

''ہیرا'' تب تمہارا رہن سہن اور مجھے ہر حوالے سے خوش رکھا ہوا تھا۔ اب گھر میں لاکر قید کر دیا ہے اُس طرح کی آزادی کے بجائے ہر چیز کو محدود کر دیا ہے۔

پہلے کی زندگی تمہارے ساتھ اور اب کی زندگی میں بہت فرق ہے۔ روز گھومنا اور شاپنگ معمول تھا۔ لیکن اب تمہارے ساتھ ایسی زندگی مجھے جہنم لگتی ہے۔

''شاہ زیب'' صبح گھر سے نکلا تو ہیرا کسی اور کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ اس کا آفیئر جس لڑکے کے ساتھ چل رہا تھا وہ اُس کے ساتھ چلی گئی۔ بغیر اجازت یا کسی قسم کے اجازت نامے کے بغیر وہ شاہ زیب کو چھوڑ کر چلی گئی۔

''شاہ زیب'' ہیرا کی اس حرکت سے بہت طیش میں آ گیا۔ اور فوراً رابعہ کو بھی اُس کے گھر سے لینے چلا گیا۔

''رابعہ'' جو کم عمری میں اپنے سے بڑے شخص کے ساتھ جہنم جیسی زندگی گزار رہی تھی۔

''بہن کے روپ میں عورت ہونے کی سزا ملی جو ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ بھائی کی خوشیوں نے کم سن بچی کو قربانی کا بکرا بنا دیا اور کچھ وجہ عورت تھی نا جس سے وہ جب جو فیصلہ کرتا رہا وہ عورت کی حیثیت سے اُس کو تسلیم کرتی رہی۔''

''رابعہ'' کی شیراز سے طلاق محض اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہ نشہ کرتا ہے یا رابعہ پر تشدد کرتا ہے۔ بلکہ اس لیے ہوئی ہیرا شاہ زیب کو چھوڑ کر چلی گئی۔

''اماں'' رابعہ تمہاری طلاق کو تین سال ہوگئے ہیں اور تمہاری عمر بھی اتنی نہیں ہے۔ تمہارے ابا اور میں سوچ رہے ہیں تمہاری شادی کر دیں۔ تاکہ تم خوش رہو۔

''رابعہ'' اماں کیسی خوشی کیا عورت بھی خوش ہونے کا حق رکھتی ہے۔ میرے اوپر سارے ظلم اس لیے ہوئے کہ میں عورت ہوں۔''

''اماں'' رابعہ ایسے نا کہہ ہم بہت مجبور تھے کیا کرتے۔ ساری صورتحال تجھ سے بھی چھپی نہیں ہے۔

''اماں'' میں اور تمہارے ابا نے تمہاری شادی کا سوچا ہے۔ تمہاری خالہ کے بیٹے کے ساتھ تمہاری شادی کر دیں۔ ہم کب تک تمہارے ساتھ ہیں۔

''رابعہ'' کی دوسری شادی ہو گئی۔ جو خوشحال طریقے سے چلتی رہی۔ پہلی بیٹی کی پیدائش کے تین سال بعد رابعہ کے ہاں دوسری بیٹی کی پیدائش ہوئی۔ رابعہ کی شادی کو چھ سال ہو گئے اور وہ اپنے گھر کو سمیٹ کے بیٹھی تھی کہ اچانک ایک طوفان سا اٹھا تو اُسے اندازہ ہوا کہ ابھی وہ عورت کا وجود رکھتی ہے جس پر جب چاہے کوئی بھی ظلم و زیادتی باآسانی کی جا سکتی ہے۔

''رابعہ'' کیا کر رہی ہو؟؟

''جی خالہ'' بات سنو۔

تمہاری بڑی جیٹھانی کی شادی کو دس سال ہو گئے ہیں لیکن اُس کے ہاں اولاد نہیں ہے۔ تو میں سوچ رہی ہوں کہ اُس کی شادی کر دی جائے۔

''رابعہ'' خالہ یہ بھی ٹھیک ہے۔

''خالہ'' بس اب تیری ماں سے بات کرنی ہے۔

''رابعہ'' کس حوالے سے خالہ بات کرنی ہے۔

''خالہ'' یہی کہ اپنی نورین کا رشتہ دے دے۔

''رابعہ'' خالہ وہ ابھی چھوٹی ہے اور وہ بھی میرے سے پھر کیسے۔

''خالہ'' کیا چھوٹی ہے تیری بھی تو پہلے چھوٹی سے بڑے عمر کے مرد سے ہوئی تھی۔ اس کا پھر کیوں نہیں ہو سکتا۔

''لو بھئی ابھی بات چل ہی رہی تھی کہ میری بہن بھی آ گئی۔ اچھے وقت پر آئی ہو۔ میں نے تمہاری طرف جانا ہی تھا۔

''رابعہ'' کو سر پر پیار دیتے ہوئے اُس کی اماں بھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ ایک طرف خالہ بیٹھی تھی اور دوسری جانب رابعہ کی اماں۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ آم اور جامن کے درختوں کے پتے صحن میں ہلکی ہوا سے لہرا رہے تھے جن کی آوازوں کے علاوہ سناٹا چھایا ہوا تھا۔

''باجی'' میں رابعہ سے اس کے جیٹھ کی بات کر رہی تھی کیوں نا اُس کی دوسری شادی کر دیں۔ اتنے سال تو ہو گئے ہیں اُس کی اولاد نہیں ہے۔ اللہ ایسے کوئی کرم کر دے۔

''آپا'' یہ تو بہت اچھی سوچ ہے۔

''باجی'' اسی لیے تو آپ سے اس حوالے سے بات کرنی ہے کیوں نا میں رابعہ کی چھوٹی بہن اور اپنی پیاری بھانجی ہی اپنے گھر لے آؤں۔

''آپا'' کیسی باتیں کر رہی ہیں۔

حیرت اور پریشانی سے آئے پسینے کو صاف کرتے ہوئے رابعہ کی اماں بولیں کہ وہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔

''آپا'' میں رابعہ کی دفعہ بھی یہ غلطی کر چکی ہوں اب یہ نہیں کروں گی۔ آپ جیسے کہیں میں آپ کو اُس کی عمر کی لڑکی ڈھونڈ دوں گی۔

''باجی'' میں لاؤ گی تو اپنی بھانجی اگر نہیں منظور تو اپنی بڑی بیٹی بھی آپ کو مبارک، ہم اسے بھی نہیں رکھیں گے۔

''آپا'' آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ میری بیٹی کا گھر اجڑ جائے گا۔

''باجی'' میں نے جو کہہ دیا وہ منظور نہیں تو اسے بھی گھر لے جائیں۔ ہم نہیں رکھیں گے۔

''رابعہ'' کے گھر آئے ایک ماہ ہو گیا تھا۔ دوسری بہن کی زندگی بچانے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا لی اور دوسری طلاق کا نشان اپنے ماتھے پر سجا کہ گھر بیٹھ گئی۔

''رابعہ''! اے رابعہ جلدی نیچے آ دیکھ تیرے ابا کو کیا ہو گیا۔

''رابعہ'' کے ابا رابعہ کا دکھ برداشت نا کر سکے اور اچانک جہان فانی سے کوچ فرما گئے۔

چند سالوں بعد رابعہ کی اماں ایک دن اُسے بیٹھا کر سمجھا رہی تھی کہ رابعہ تیرے ابا بھی نہیں اور سب اپنے گھر والے ہو گئے ہیں۔ تمہاری بھی کہیں شادی کر دوں۔ کتنی دیر رہوں گی تمہارے ساتھ اپنے ہوتے ہوئے کسی کہ ساتھ تمہارا گھر بس جائے۔

''رابعہ'' آنسو سے بھری ہوئی آنکھوں سے اماں کو دیکھتی رہی۔ اور ایسی آواز میں بولی جیسے سالوں کا دکھ کوئی باہر اُگل رہا ہو۔

''میں عورت ہونا اس لیے مجھے بغیر کسی غلطی کے یہ سزا ملی اور نجانے کتنی سزا ابھی اور ملنا رہتی ہے۔ کوئی عورت غلطی یا کوتاہی کرے تو اُس کو اُس کے کیے کی سزا ملے تو پھر بھی حوصلہ ہو جاتا ہے۔ لیکن مجھے ابتدا سے ابھی تک بغیر کسی غلطی کیے کی سزا مل رہی ہے۔''

''اماں'' کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور دونوں زور و قطار روتی رہیں۔

''رابعہ'' میں چاہتی ہوں کسی کے ساتھ تمہارا گھر بس جائے۔ کب تک میں ہوں۔

''رابعہ'' کچھ حد تک راضی ہوئی اور پچیس سال کی لڑکی کی چھپن سالہ آدمی سے تیسری شادی ہوئی۔ محض اس نیت سے کہ عورت ہوں شاید اب ہی کوئی اچھی زندگی کی طرف آ سکوں اور ایک سہارا مل جائے۔

''رابعہ'' نعیم کے ساتھ دوبئی کے ٹور پر گئی جو مسلسل جاتی رہتی تھی۔ اُس کی زندگی اب اس موڑ پر تھی کہ نعیم جب چاہتا اُس کے پاس آ کر رہتا زیادہ تر وہ اکیلا باہر رہتا۔

''رابعہ'' الگ گھر میں رہتی تھی۔ اچانک ایک

دن نعیم واش روم میں گئے اور کال پر کال آ رہی تھی جس پر کسی بچی کی تصویر لگی تھی۔ رابعہ نے فون اٹھایا تو کوئی بچی انگلش میں بات کر رہی تھی۔

''نعیم'' واش روم سے نکلتے ہی چلانے لگا۔ میرا فون تم نے کیوں اٹھایا ہے۔

''رابعہ'' آپ کے کوئی بچے بھی ہیں کیا جب کہ آپ نے میری اماں کو بتایا تھا کہ میرا کوئی بھی نہیں ہے۔

''نعیم'' تمھیں ہر بات بتانا ضروری نہیں ہے جتنا تمہارا کام ہے اُتنا ہی کرو۔

''رابعہ'' آپ مجھے ایک کھلونا سمجھ کر استعمال کر رہے ہیں۔ جب چاہا ساتھ رہ لیا، گھوم لیا، جب چاہا چھوڑ دیا۔ آپ نے میرے سے یہ بات کیوں چھپائی۔

''نعیم'' زیادہ بکواس نا کرو۔ ہاں میرے بچے اور بیوی قطر میں ہیں۔

''رابعہ'' پھر میرے سے شادی کیوں کی۔

''نعیم'' رابعہ چلو اپنی اماں کے گھر رہ لو میں کچھ دن کے لیے ضروری کام سے جا رہا ہوں۔

''رابعہ'' کو اماں کے گھر آئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ نعیم کا فون بھی بند تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ پوسٹ مین نے کچھ لفافہ اُس کے ہاتھ میں تھمایا جس کو دیکھ کر ایک دم سے سکتے میں چلی گئی اور وہیں زمین پر گر کر رونے لگی۔

''اماں'' آوازیں لگاتی رہی۔ رابعہ کون ہے اور کیا ہوا تمھیں۔ یہ کیسا لفافہ ہے۔

''اماں'' نعیم نے مجھے طلاق بھیج دی ہے۔ میرا صرف قصور یہ تھا کہ بیوی کی حیثیت سے اُن کی فیملی کا پوچھ لیا۔

''رابعہ اور اماں رونے لگیں۔ اماں نے رابعہ کو گلے لگایا۔ میری رابعہ صبر رکھ۔ اماں میں نے کیا کوتاہی کی جو مجھے تین طلاقیں ہوئیں جبکہ میں قصوروار بھی نہیں ہوں۔

''میرا قصور صرف یہ ہے کہ میں عورت ہوں نا۔ جو معاشرے اور اُس میں رہنے والوں کے ستم محض عورت پر ہی چلتے ہیں۔ مجھے ایسے کھلونا سمجھ لیا گیا ہے کہ جب جس کا دل چاہتا ہے بہت آسانی سے نکال پھینکتا ہے۔

ایک سال بعد رابعہ نے اپنے گھر میں پارلر کھول لیا اور اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگی۔

''اماں'' رابعہ کہیں اگر تم کہیں چاہو تو بیاہ کر لو۔

''رابعہ'' اماں جس عورت کو تین طلاقیں ہو گئیں ہوں۔ کیا وہ دوبارہ اتنا حوصلہ رکھ کر اس راہ پر جائے گی۔ معاشرے میں رہنے والوں نے سزا دی محض اس لیے کہ عورت ہوں نا۔

☆☆☆☆☆

میرا بھائی طارق خان [خاکہ]

میں اور طارق برسوں اکٹھے رہے، ہنستے کھیلتے رہے۔ خوب قہقہے لگتے، لیکن جب ہم دونوں عملی زندگی میں داخل ہوئے، تو ہمارے وہ قہقہے نہ جانے کہاں کھو گئے۔ اُس کی زندگی بڑی ہنگامہ خیز رہی ہے۔ یہ 1955 میں پیدا ہوا تو کچھ دن بعد ہی لاہور میں بڑا سیلاب آ گیا۔ لوگ دو ہفتے سے زیادہ اپنے گھروں کے اوپر والے پورشنوں میں مقید ہو کر رہ گئے ہم لوگ راولپنڈی میں مقیم تھے کہ میری سب سے چھوٹی بہن انیلہ نے جنم لیا۔ والد صاحب کی ایک عزیزہ کئی دن تک ہمارے پاس رہی تو وہ اُسے ''شوری'' کہنے لگی، یعنی بہت شور کرنے والا۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی ''تاری بڑا رشٹی (یعنی شریر) ہے'' ہم سب اسے تاری کہتے تھے۔ لاابالی پن اس میں بچپن سے ہی ہے۔ ہم محلہ عیدگاہ میں رہتے تھے، وہاں قریب ہی ایک نالہ لئی تھا۔ ایک دن یہ نالہ لئی میں دونوں ٹانگیں ڈال کر کافی دیر بیٹھا رہا۔ اسے سردی لگ گئی اور بخار بھی ہو گیا۔ ایم بی بی ایس ڈاکٹر کے علاج سے بڑی مشکل سے ٹھیک ہوا۔

محمد ہمایوں

یہ اسلامیہ کالج سول لائنز میں زیرِ تعلیم تھا کہ ایک ادارہ میں اس کی سلیکشن ہو گئی۔ ٹریننگ میں کامیابی کے بعد اس کو سترھویں گریڈ کے برابر عہدہ مل جانا تھا لیکن ٹریننگ ختم ہونے سے کچھ دن پہلے بقول اس کے، وہ وہاں اپنے افسر سے الجھ پڑا اور واپس بھیج دیا گیا۔

بہرحال اس نے بمشکل خود کو سنبھالا اور کرکٹ میں مصروف کرلیا۔ سگریٹ بہت پینے لگ گیا۔ میرے کہنے پر اس نے بی اے کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ میں نے ایم اے جس مضمون میں کیا تھا، اس نے بی اے میں وہ مضمون بھی رکھا۔ سو میں نے اسے گائیڈ کیا۔ بی اے کر کے وہ پی آئی اے میں جاب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب اس کی شادی ہوئی تو اس کے سسرال والے اسے تاری کے بجائے طارق خان کہنے لگے۔ اس نے اپنے ایک کولیگ سے پی آئی اے کالونی میں ایک پلاٹ رعایتی قیمت پر خرید رکھا تھا، لہٰذا وہ بیچ کر پانچ مرلہ کا ایک مکان خرید لیا اور صاحبِ مکان بن گیا۔ میں صاحبِ کتاب بعد میں بنا تھا۔

طارق کے سسر اور اُسکی بیوی کے تین بھائی کاروبار کرتے تھے۔ سو شادی کے بعد طارق بھی کاروباری بن گیا۔ ویسے وہ بیرون بین (Ectrovert) پہلے سے تھا۔ وہ سوچوں میں گم رہنے والا آدمی نہیں ہے، بلکہ بڑا عملی آدمی ہے۔ بہت سال پہلے مجھے ایک بزرگ وکیل صاحب نے کہا تھا کہ ایم اے آدمی کو آئیڈیلسٹ بنا دیتا ہے جبکہ ایل ایل بی پریکٹیکل۔ میں نے زندگی میں پیسے کو کبھی اتنی اہمیت نہیں دی۔ ہمارے والد صاحب بھی پیسے کے پیچھے کبھی نہیں بھاگے۔ والد صاحب نے ہم دونوں بھائیوں اور روبینہ اور دو چھوٹی بہنوں کی تربیت بھی کی، لیکن طارق مختلف نکلا، یا تو اس لیے کہ ایامِ نوجوانی میں اسے ایک "Setback" رکاوٹ اور بحران کا سامنا رہا ہے یا پھر وہ ہمارے بڑے ماموں سے بڑا متاثر ہے اور اس نے انہی کا اسلوب زندگی اختیار کرلیا ہے۔ ہمارے یہ ماموں ساری عمر محکمہ فیڈرل ایکسائز و کسٹم میں ایک کامیاب انسپکٹر رہے اور ترقی پاکر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور سپرنٹنڈنٹ بن کر اچھی پوسٹنگ کرواتے رہے اور اچھا معیارِ زندگی اختیار کیا اور یہی امران کے لیے وجہ اطمینان "Point of Satisfortion" تھا۔

میں نے 1974 میں ایک کمرشل ڈرامہ

''تیجی شادی'' میں کام کیا تھا۔ یہ ڈرامہ ایجوکیشن ہال متصل عجائب گھر مال روڈ پر چودہ دن لگا رہا اور بڑا کامیاب رہا۔ طارق ہمارے اسی ماموں کے ساتھ اسے دیکھنے آیا تھا۔ مجھے اُس وقت کا منکسر المزاج سا تاری بھی یاد ہے۔ کل کا وہ تاری جس میں عجز و انکسار تھا، آج کا طارق خان ہے، جس میں تمکنت ہے۔

جاب کے پہلو بہ پہلو وہ کاروں کا کام بھی کرنے لگا۔ مجھے یاد ہے جب میں اس کے گھر واقع سانده ہومز جاتا تھا تو وہ اکثر ڈیفنس میں ایک کار ڈیلر کے پاس جایا کرتا تھا۔ جہاں سے وہ گاڑی خریدا بھی کرتا تھا اور منافع حاصل کرتے ہوئے فروخت بھی کرتا تھا۔ اس کا صاحبزادہ وسیم اس کے ساتھ ساتھ ہوتا۔ کاروں کے کاروبار میں اسے کافی فائدہ ہوا اور اس نے اپنا مکان بیچ کر ایک اچھی لوکلیٹی میں دس مرلے کا مکان خرید لیا۔ ہمارے یہاں جو شخص دس مرلہ کا مکان بنا لے، خواہ اس کی تعلیم واجبی ہو، یا گریجوایٹس بھی، پھر انھوں نے بالعموم پانچ مرلے کے مکان کے مکین کی بات نہیں سنی۔ خواہ وہ کتنا ہی وسیع المطالعہ کیوں نہ ہو۔ انھیں یہی گمان رہتا ہے کہ بغیر کسی مطالعہ اور کوشش کے پاکستان میں رائج تمام علوم پر بھی انھیں دسترس حاصل ہو گئی ہے۔ ویسے طارق ایسا نہیں سمجھتا۔ اگر اس سے اردو ادب پر بھی بات کی جائے تو کہتا ہے کہ مجھے ان باتوں کا نہیں پتہ۔ البتہ اس میں خود پسندی ہے۔

طارق سمارٹ تھا، موسم کے مطابق اچھے کپڑے پہنتا تھا۔ اس نے مجھے ایک دفعہ بتایا تھا کہ لاہور ایئر پورٹ پر دورانِ ڈیوٹی اُس کا ایک جواں سالہ خوش شکل اور مشہور گلوکارہ سے رابطہ ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا اور وہ شادی کے لیے تیار ہو گئی۔ یہ اُس کے گھر گیا، جس کمرے میں اُسے بٹھایا گیا وہاں رکھے اتنے زیادہ ساز اور طبلے سارنگیاں دیکھ کر ہی بھاگ آیا۔

اوائل جوانی سے ہی، وہ بڑا سخت جان اور پھرتیلا تھا۔ گھر میں چھوٹے چھوٹے کام جیسے بجلی کے ابتدائی کام کر لیتا ہے۔ اسے کتابیں پڑھنے کا زیادہ شوق نہیں ہے۔ کمپیوٹر پر گیمز کھیلنا پسند کرتا ہے۔ جیسا کہ میں نے اس خاکے کے آغاز میں کہا تھا کہ وہ بچپن میں شریر تھا۔ اور ایسے بچے بڑے ہو کر ہوشیار نکلتے ہیں۔ طارق بھی سادہ آدمی

نہیں ہے، اسی لیے کاروں کی خرید و فروخت میں کامیاب رہا اور کار ڈیلروں سے نمٹنے میں بھی۔
میں محکمہ کسٹم میں ایگزیکٹو پوسٹ پر رہا ہوں۔ میری پوسٹنگ لاہور ایئرپورٹ ٹریفک اور چیکنگ میں ہوتی رہی ہے۔
طارق کی ڈیوٹی بھی یہی ٹریفک میں تھی اور وہ ڈومیسٹک فلائٹس کیا کرتا تھا۔ جب کبھی میرا ڈومیسٹک لاؤنج سے گزر ہوتا اور میں دیکھا کرتا کہ وہ کاؤنٹر پر کھڑا مسافروں کی میکانکی انداز میں ڈیل کر رہا ہوتا۔ ویسے بھی کبھی مجھے اس میں پیشہ ورانہ جذبہ بھی نظر آتا۔ جب وہ ڈیوٹی نہ کر رہا ہوتا یا ایئرپورٹ کے باہر کھڑا ہوتا تو اس میں لاابالی پن نظر آتا۔ بہرحال وہ محنت سے ڈیوٹی سرانجام دیتا رہا اور آخری سالوں میں اسے "Passenger Facilitation Officer" مسافروں کو سہولیات مہیا کرنے والا افسر بنا دیا گیا۔ لیکن اُس کے لیے زیادہ وجہ اطمینان بات یہ تھی کہ اس آرگنائزیشن میں ایئر ٹریول کو بڑی ہی سہولت میسر تھی۔ وہ آسٹریلیا اور یورپ کے کچھ ممالک کی سیر کر آیا تھا۔ حج بھی کر آیا تھا اور عمرہ بھی۔

ریٹائرمنٹ سے چند سال پہلے اُسے پھر ایک "Set back" رکاوٹ یا یوں کہہ لیں کہ بحران نے آگھیرا۔ اُسے صحت کی خرابی کا سامنا تھا اور اسی گراؤنڈ پر وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لینا پڑی۔ وہ کاروں کا کاروبار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ عرصہ بڑا پریشان رہا۔ کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ کیا کرے۔ پی آئی اے میں پنشن بھی بڑی کم ملتی ہے۔ اس کی تینوں بیٹیاں اور بیٹا پڑھ رہا تھا۔ اس کی زندگی منیر نیازی کے اس شعر کے مصداق ہے۔

”مجھے ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر
ایک دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا“

....

اُس نے ہمت نہیں ہاری اور حالات ٹھیک کرنے کے لیے پلاننگ شروع کر دی اور اسے اکلوتے بیٹے وسیم کو برطانیہ بھیج دیا۔ اسے وہاں اچھی جاب مل گئی۔ وہیں اس نے تحصیل علم بھی کیا۔ وہ باپ کا دستِ بازو بن گیا۔ میرا بھائی طارق وسیم اور اس کے بچوں کو دیکھ کر جیتا ہے۔ روزانہ انھیں ویڈیو کال کرتا ہے۔ وسیم اُس کے لیے شجرِ سایہ دار کی مانند ہے۔

☆☆☆☆☆

گل نوخیز اختر

گل صاحب سے ہمارا تعارف جناب ادریس قریشی کے ذریعے ہوا۔ جب ہم نے اپنی کتاب ''صاحب بہادر کی نگری'' لکھی تو اس پر کسی اچھے مزاح نگار کی رائے درکار تھی لیکن کیوں کہ ہمارا ادیبوں سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں تھا اور چند ایک کو ہم جانتے تھے وہ نثر نگار نہیں شاعر تھے۔ ادریس قریشی نے گل صاحب کا نمبر عطا کیا۔ ہم نے بات کی۔ گل صاحب نے کہا کہ وہ پڑھے بغیر بالکل کتاب پر رائے نہیں دیں گے۔ ہم نے بھی کتاب کا مسودہ ان کے پتہ پر ارسال کر دیا اور گل صاحب نے کتاب کا فلیپ لکھ دیا اور کمال مہربانی کی کہ کتاب پر اپنا کالم بھی اخبار میں لکھ کر بھیج دیا اور وہ چھپ گیا۔ انھوں نے لکھا:

نا ممکن ہے کہ اردو مزاح نگاری کی تاریخ لکھی جائے اور ''صاحب بہادر کی نگری'' نظر انداز ہو جائے۔

ویسے میری گل صاحب سے نہ ملاقات تھی نہ کوئی جان پہچان لیکن انھوں نے جو میری کتاب پر رائے دی تو دل باغ باغ ہو گیا۔ یہ نہیں تھا کہ تعریف اچھی تھی بلکہ ایک ایسے شخص کی جانب سے جو طنز و مزاح کی دنیا کا جھومر ہے کیوں کہ گل صاحب کے مطابق تاج تو عطاالحق قاسمی صاحب ہیں۔

کچھ عرصے بعد ہمارا تبادلہ خوشاب سے لاہور ہو گیا تو گل نوخیز اختر صاحب سے ملاقات کا سبب نکل آیا۔ ''گل نوخیز اختر'' صاحب کا نام کافی منفرد ہے اور آج تک ہم نے کسی مرد کو ''تازہ پھول'' نہیں دیکھا۔ تازہ پھول تو ہمیشہ خواتین کے لیے استعمال ہوتا ہے اور بلکہ ''تازہ کلی'' تو سب کو پسند آتی ہے۔ یہی بات گل صاحب اکثر سناتے ہیں کہ کیسے ان کا نام سن کر لوگ ان کو عورت سمجھ لیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ایک شخص تو ان کا اتنا عاشق ہو گیا کہ خطوط کا تبادلہ ہونے لگا۔ ایک بار عاشق صاحب نے گل نوخیز کی تصویر مانگی اور جب گل صاحب نے اپنی داڑھی والی تصویر بھیجی تو

محمد کلیم

اس نے جواب دیا "صوفی اے توں چنگا نہیں کیتا"۔ ویسے تو ان کا نام قلمی لگتا ہے لیکن اگر ان کے والدین نے رکھا ہے تو انھوں نے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے رکھا کیوں کہ ان کو دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ "گل نوخیز" یہ ہے۔ لمبا قد، سانولا رنگ، چوڑا سینہ، کالے گھنے بال (یقیناً رنگ کیے ہوئے)۔ وہ ہنستے نہیں ہیں بلکہ قہقہے لگاتے ہیں۔ ہم نے ان کو ہر وقت حالتِ قہقہہ میں دیکھا ہے۔ ان کے پاس اتنے قصے ہیں کہ اگر آپ سننے بیٹھیں تو دن سے رات ہو جائے اور وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلے۔ وہ ایک عمدہ کہانی کار ہیں لیکن ہمیں وہ اکثر ایک پرانے حوالدار لگتے ہیں جو اپنے قصوں کی پٹاری کھول کر تھانے میں رات کو سناتا ہے کہ کس طرح اس نے فلاں فلاں مجرم کو قابو کیا، کیسے زندگی نے اس کا ساتھ دیا اور وہ موت سے بال بال بچا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حوالدار صاحب کے قصوں میں سچائی کم اور تخیل زیادہ در آتا ہے اور وہ مزے لے لے کر ڈرامائی انداز میں قصہ گوئی جاری رکھتا ہے اور رات اچھی کٹ جاتی ہے۔

گل نوخیز اختر صاحب کا بچپن ملتان شہر میں گزرا جہاں انھوں نے عمران سیریز، عمرو عیار کی کہانیوں سے اپنے مطالعہ کا آغاز کیا اور پھر مطالعہ بڑھتا گیا اور آپ روزگار کی تلاش میں لاہور تشریف لے آئے اور یہاں آنے سے پہلے آپ باقاعدہ مصنف بن چکے تھے اور آپ کی ایک افسانوں کی کتاب چھپ چکی تھی یعنی آپ نے کتابوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کے چہرے، زندگی کے حالات بھی پڑھنا شروع کر دیئے تھے۔ لاہور آ کر آپ نے کامیابی کے جھنڈے نہیں گاڑ لیے بلکہ بڑی مشکل میں وقت گزارا۔ داتا صاحب نے مدد کی اور کھانا اور سونے کی جگہ فراہم کی۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ لاہور میں داتا صاحب اگر نہ ہوتے تو یہ ظالم شہر کئی لوگوں کو بھوکا مار دیتا۔ یہاں سے آپ نے اپنا سفر شروع کیا اور ایک اخبار میں لکھنا شروع کیا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ ان کی ملاقات کب قاسمی صاحب سے ہوئی اور وہ کب آپ کے استادِ محترم بنے لیکن گل نوخیز اختر کی زندگی پر عطاالحق قاسمی کا اثر خوب نظر آتا ہے کیوں کہ عطاالحق قاسمی اور گل نوخیز میں دو چیزوں مشترک ہیں "ایک سگریٹ اور دوسرا مزاح"۔ یہ دونوں اس کے بغیر نہیں جی سکتے اور ان دو

کاموں کو کسی اور کو کرتا دیکھتے ہیں تو اس کی مدد کے لیے آگے آگے نظر آتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ گل نوخیز صاحب اکیلے نہیں پیتے ''سگریٹ'' کچھ اور نہ سمجھ لیجیے گا، ہمیشہ دوسروں کو بھی دعوت دیتے ہیں۔ ہر مزاح نگار سے پیار کرتے ہیں۔ مزاح نگار کبھی دوسرے مزاح نگار سے حسد نہیں کرتا کیوں کہ دونوں کو معلوم ہوتا ہے کہ سب نے اپنی اپنی کر کے کھانی ہے۔

گل صاحب کہتے ہیں کہ پہلے وہ شاعر بننا چاہتے تھے اور اس کے لیے انھوں نے ایڑھی چوٹی کا زور لگایا۔ ہر مشاعرے میں پہنچے اور کئی غزلیں لکھ کر استاد شعرا کو سنائیں اور پڑھائیں لیکن ان کو ہمیشہ جگہ مشاعرے کی پچھلی صف میں ہی ملی، اس لیے جب ان کا قافیہ ردیف شاعری سے نہیں مل سکا تو وہ چھلانگ لگا کر مزاح نگاری کی صف میں شامل ہو گئے اور صفِ اوّل میں جگہ پائی۔

ہم نے ان کے طفیل کئی ٹیلی ویژن پروگراموں میں شرکت کی۔ وہ ہر ابھرتے ہوئے مزاح نگار کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں اور اپنی ''ہیکلی غزل'' اس کے ساتھ گنگناتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے ایک یوٹیوب چینل بھی بنا رکھا ہے جس میں غیر سیاسی مزاح نگاری کی جاتی ہے اور ہر لکھنے والے کو دعوتِ عام ہے کہ وہ اپنی تحریر پڑھ کر ان کو بھیجے، وہ اس کو چینل کا حصہ بنائیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ اس چینل پر ہماری ویڈیو نے اب تک 250 سے زیادہ ویوز نہیں لیے لیکن اس میں شاید چینل نہیں ہمارے پھیکے مزاح کا قصور ہے جو لوگوں کے دلوں تک نہیں پہنچ پایا۔ جو بھی ہے اڑھائی سو لوگوں نے تو دیکھا ورنہ تو آپ پانچ سو کتابیں چھاپیں، ان کو بانٹنا عذاب بن جاتا ہے۔ چلیں ایک نیک کام آپ نے شروع کر رکھا ہے، اس کو جاری رہنا چاہیے۔ گل نوخیز صاحب ایک محنتی آدمی ہیں اور ان کے کام میں محنت جھلکتی ہے۔ ان کے کالم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کہانی اور مزاح دونوں بین بین چلتے ہیں اور ایک دوسرے کو محفوظ کرتے نظر آتے ہیں۔ دعا ہے کہ وہ اپنا کام جاری رکھیں اور سگریٹ پیتے رہیں، لوگوں کے لبوں پر مسکراہٹیں اور سوچنے پر مجبور کرتے رہیں۔

☆☆☆☆☆

طلباء، ہمارا سرمایۂ افتخار [طنز و مزاح]

استاد یاری خان کے ذاتی کھاتے میں درج منقولہ و مقبولہ چیدہ چیدہ خطاوں میں سے اگر محض زبان کی لغزشیں نکال دی جائیں (حالانکہ انہیں لغزشیں کہنا بھی جرم و خطا کی توہین ہے) تو باقی جرائم شاید صفر کا ہندسہ بمشکل پار کر پائیں گی - قدموں کی لڑکھڑاہٹ کے ساتھ ساتھ ان کی زبان بھی اکثر و بیشتر لڑکھڑا ہی جاتی ہے- جرائم کی کثیر تعداد جلیبی کے ان گنت پیچیدہ حلقوں کی مانند بے شمار دائروں میں بل کھاتی اس کی زبان کے گرد تیزی سے گھومتی رہتی ہے- اب دیکھئے نا! حضرت سیکھنے کے عمل کو سزا اور سکول کو بچے کا ابتدائی قید خانہ سمجھتے ہیں اور اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے ایسے ایسے دلائل ڈھونڈ کے پیش کرتے ہیں کہ بندے کا اپنی سماعت اور دوسروں کی بصارت پر اعتبار ہی ختم ہو جاتا ہے- مثال کے طور پر طالب علموں کا ذکر کرتے ہوئے وہ انتہائی دیدہ دلیری سے کہتے ہیں، "ماہرین کو چھوڑیں جی؛ ہماری نظر میں زیرِ تعلیم افراد کی فقط دو ہی قسمیں ممکن ہیں یعنی طالب علم اور تائب علم- ان میں فریق ثانی یعنی تائبین علم تعلیم و تعلم کے جھنجھٹ سے نہ صرف خود دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اپنے طرزِ عمل سے دوسروں کو تائب و توبہ گار کرانے میں بھی ہمیشہ پیش پیش ہی رہتے ہیں -

بات طالب علموں کی چل نکلی ہے تو سن لیجئے- دو رائے تو کیا میرے خیال میں تو اس بات کے متعلق اب کئی ایک رائیں ہو سکتی ہیں کہ کسی سکول، کالج یا مدرسے میں داخل بچے یا بچیاں واقعی فی الحقیقت "طالب علم" کہلانے کے قابل ہوتے بھی ہیں یا نہیں اور کیا تمام بچے طالب علم کے لئے مختص و مقرر اصول و شرائط پر پورے بھی اترتے ہیں؟

یہ بات تو طے ہے کہ علم حاصل کرنے اور سکول کالج، مدرسے یا یونیورسٹی میں داخل ہر بندہ طالب علم ہی کہلاتا ہے خواہ وہ حصول علم کا مدعی اور خواہشمند ہو یا نہ ہو-

ہم بھی دعوائے ہنر رکھتے ہیں!!!

اب کسی نہ سیکھنے والے فرد کو ہم بھلا طالب علموں کی لمبی قطار سے کیسے نکال باہر کر سکتے ہیں- طالب علم کے معنی و مفہوم کسی سے بھی

نور کمال شاہ

پوچھ لیجئے یا لغت میں ڈھونڈ نکال لیجئے گا؛ معنی وہی ایک ہی برآمد ہوں گے کہ ہر وہ بندہ جو علم سیکھنے کا طلب گار ہو، جو کوئی علم یا فن سیکھتا ہو یا سیکھنے کی کوشش کر رہا ہو طالب علم ہی کہلاتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں دیگر بہت سے مفاہیم کے بدلنے کے، ''طالب علم'' کا مطلب بھی بعض مواقع پر بدل جاتا ہے۔ یعنی یہاں کسی سکول یا کالج جانے والا وہ بندہ بھی ''طالب علم'' ہی کہلاتا ہے جو سیکھنے یا علم حاصل کرنے کا بالکل بھی شوقین اور خواہش مند نہ ہو۔ چنانچہ ہمارے ہاں طالب علم وہ بھی ہے جسے استادِ محترم کے حکم پر دن دہاڑے چار چھ طلباء کا چھاپہ مار دستہ بغیر وارنٹ کے اس کے گھر میں گھس کر وہاں سے ہاتھ پیر پکڑے اٹھا کر زبردستی نکالتا ہے اور چیختے چنگھاڑتے سکول پہنچا آتا ہے۔ دوم وہ بھی تو طالب علم ہی کے زمرے میں شمار ہیں جو صبح گھر سے بستہ اٹھا کر بجائے سکول پہنچنے کے کسی کھیت کی پگڈنڈی کی راہ لیتے ہیں یا نزدیکی ٹیلے پہ چڑھ کر پورا دن گزار دیتے ہیں اور پھر چھٹی کے وقت دیگر ساتھیوں کے ہمراہ یوں تھکے ہارے گھر پہنچتے ہیں گویا مہینے بھر کا کام انھوں نے آج کے ایک ہی دن میں مکمل کیا ہو! ۔ ایسا کر کے وہ منوں کے حساب سے اپنا احسان بھی والدین کے کھاتے میں ڈال جاتے ہیں کہ چلئے حضور! آپ لوگوں کی مرضی و منشا کے مطابق ہم سکول ہو آئے، اب خوش!!!

روزانہ صبح سویرے سکول جاتے وقت دل ہی دل میں انتہائی عاجزی کے ساتھ تیز طوفانی بارش کی دعائیں مانگنے والے بچے یا اچانک کسی ایسے حادثے کے تمنائی جس سے سکول جانا کم از کم اس دن کے لئے موقوف ہو جائے، بھی طالب علم ہی کہلائے جا سکتے ہیں۔ سینکڑوں تو اس ارمان کے ساتھ سکول روانہ ہوتے ہیں کہ کاش ہمارے پہنچتے ہی منزل غیر مقصود پر کوئی ایسا نظارہ دیکھنے کو ملے کہ راتوں رات سکول کی عمارت گر کر ملبے کا ڈھیر بن چکی ہو؛ مگر بدقسمتی سے انہیں ایسا کوئی منظر دیکھنا کبھی نصیب ہی نہیں ہوتا۔ ان میں سے سینکڑوں ہزاروں اپنی اس اجتماعی بدنصیبی پر شاکی بھی نظر آتے ہیں کہ خالق نے ہر دن کو اتوار کیوں پیدا نہیں کیا۔ اگر ہر دن اتوار ہوتا تو خالق و مالک کے خزانوں میں کون سی کمی آ جاتی۔ انہیں یہ بھی گلہ ہوتا ہے کہ بانیٔ پاکستان کی یاد میں فقط ایک دن منا کر کیا ہم ان کی خدمات کو پس پشت نہیں ڈال رہے۔ خالق پاکستان کی یاد میں تو کئی کئی چھٹیاں ہونی چاہئیں تھیں!!!

مندرجہ بالا حساب سے اگر دیکھا جائے اور رجسٹرات میں درج اعداد و شمار کو اگر درست

تسلیم کیا جائے تو ہمارے ملک میں ہر سال لاکھوں طالب علم تعلیم پا کر فارغ ہوتے ہیں- حیرت کی بات ہے کہ یہ تمام قسم کے طالب علم واقعی پاس اور کامیاب بھی ہو جاتے ہیں کیونکہ آج تک ہم نے سکول کی عمارت سے جڑے رہنے والے کسی طالب علم کو ناکام ہوتے نہیں دیکھا خواہ اس کی اکتسابی یا غیر اکتسابی حالت کیسی ہی کیوں نہ ہو- (حکومت نے زیادہ سے زیادہ طلباء کو پاس کرنے کے لئے بے شمار تعلیمی بورڈز اور یونیورسٹیاں قائم کر رکھی ہیں کیونکہ تعلیمی ادارے اپنے ہی طلبا کو بڑی تعداد میں پاس کرنے میں ناکام ثابت ہو چکے تھے اس لئے امتحانات کی ذمہ داری ان سے لے کر بورڈ کے حوالے کر دی گئی ہے) ناکام بس وہی طلبا رہتے ہیں جو جذبات کی رو میں بہہ کر سکول سے باقاعدہ دشمنی مول لیتے ہیں اور بھگوڑے بن کر کبھی وہاں نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں-

ایک لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ہمارے ملک کی سب سے بڑی پیداوار اس وقت ہمارے عزیز طلبا ہی ہیں جو ہر سال ایک بڑی تعداد میں تحصیل علم سے فراغت پا کر اپنے پورے خاندان کے لئے باعث بے قراری اور وطن عزیز کے لئے بے روزگاری کا سبب بنتے ہیں- یہ تمام نونہالان حقیقتاً سکول و کالج کی عمارات سے فارغ تو ہوتے ہیں؛ حصول علم سے فارغ ان میں سے فقط چند ہی ہوتے ہیں-

(مرحوم) پطرس بخاری نے طلبا کو لاہور کی سب سے بڑی پیداوار قرار دیا تھا حالانکہ ہمارے خیال میں طلبا بلاشبہ آج ہمارے ملک کی سب سے بڑی پیداوار ہیں- یہ ہمارے ملک کی وہ واحد پیداوار ہے جس میں ہم خود کفیل ہیں اور انہیں وافر مقدار میں برآمد بھی کر سکتے ہیں - ہر سال لاکھوں کروڑوں کے حساب سے ہر عمر، ہر وضع، ہر قماش اور ہر رنگ و روپ کے طالب علم ہماری تعلیمی فیکٹریوں میں تیار ہوتے ہیں اور وہاں سے نکل کر یہ لوگ ملک کے طول و عرض میں پھیل کر بے روزگاری اور بے چینی میں اضافے کا سبب بنتے ہیں- ملک میں بے روزگاری کی شرح بڑھانے میں ان طلبا کا بہت اہم اور کلیدی کردار ہوتا ہے- چھوٹے، بڑے، موٹے، سرخ، سفید، اعلیٰ، ادنیٰ ہر طرح کے طالب علم ہمارے یہاں آرڈر پر تیار ہوتے ہیں جو فارغ ہو کر دلوں میں تعمیر وطن کا جذبہ لئے ہمیں ہر چوک اور ہر چوراہے پر دال چنے بیچتے یا بسوں میں پاپڑ اور چورن فروخت کرتے کثرت سے نظر آتے ہیں - گویا اسلم کولسری صاحب کے الفاظ میں؛

اسلم بڑے وقار سے ڈگری وصول کی اور اس کے بعد شہر میں خوانچہ لگا لیا

ان میں سے فقط چند قسمت کے دھنی اور مقدر کے تیز، پیدائشی خوش نصیب ہی سرکار کی دربار اور سرکاری اداروں تک رسائی پاتے ہیں، باقی یا تو اندرون شہر اپنے نصیب کا ماتم کرتے ہوئے معمولی اشیا آلو سموسے وغیرہ بیچنا شروع کر لیتے ہیں اور یا پھر کسی بحری لانچ میں بیٹھ کے اس کے ذریعے غیر قانونی طور پر بیرون ملک رزق تلاش کرنے نکلتے ہیں اور زیادہ تر سمندر کی تہہ میں پہنچ کر مچھلیوں کی خوراک بن جاتے ہیں (ایک حالیہ سروے کے مطابق پچھلے دو تین سالوں میں دس لاکھ سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ روزگار کی تلاش میں بیرون ملک جا چکے ہیں)

طالب علموں کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں - ذہین، محنتی، غبی، کند ذہن، نالائق، چالاک، مسمسے، حاضر جواب، کام چور اور شیطان و شرارتی - سکول اور کالج وغیرہ میں بیک وقت کئی ایک قسموں کا سامنا کرنا پڑتا ہے- ان میں سے بعض ظالم تو اتنے سنگدل ہوتے ہیں کہ کمرۂ جماعت میں باقاعدہ استادِ محترم کی حاکمیت کو کھلم کھلا چیلنج کرتے ہیں- ایسی صورت حال میں شاگرد کے دل سے یہ دعائیں نہیں نکلتیں کہ باری تعالیٰ استادِ محترم آج چھٹی پر ہوں تو مزہ آجائے بلکہ یہاں استادِ محترم مذکورہ طالب علم کی چھٹی کی دعائیں گڑگڑا گڑگڑا کر مانگتے ہیں- کلاس میں دورانِ لیکچر مسلسل کھسر پھسر کرتے بچے کو جب استادِ محترم نے کھڑا کر کے رعب سے پوچھا کہ توجہ کدھر ہے تیری؟ بتاؤ کیلشن کہاں پیدا ہوئے تھے تو اس نے فوراً ہی بے دھڑک کہہ دیا: ''سر! گوجرانوالے میں'' اور پوری کلاس کے نہ صرف قہقہے چھوٹ پڑے بلکہ استادِ محترم کو بھی نادم و شرمندہ ہو کر اپنا سر پکڑنا پڑا-

استاد یاری خان کے خیال میں بعض طلبا پیدا ہی فقط اس لئے ہوتے ہیں کہ طالب علم بن کر اپنے والدین کی جائز و ناجائز دولت کی تطہیر کا باعث بن سکیں- یہ طلبا والدین کی حرام و حلال سے جمع کردہ دولت کو دل کھول کے اڑاتے ہیں اور ایسا کرنا اپنا پیدائشی اور طالب علمانہ حق بھی سمجھتے ہیں-

کچھ عرصہ قبل تک بچے کو طالب علم بنانا اور اسے سکول میں بٹھانا کتنا مشکل اور جان جوکھوں کا کام تھا، اس کا اندازہ موجودہ دور کے والدین نہیں لگا سکتے - چند دہائیاں پہلے طریق کار آج سے بالکل مختلف تھا - دس بارہ سال تک گلی کوچوں میں آوارہ گردی کرنے کے بعد ہی بچوں کو اچانک علمی تڑپ سے بے قرار ہو کر سکول میں بٹھا دیا جاتا تھا- بڑی عمر کے انتہائی شرارتی بچوں کو سنبھالنا اور انہیں پڑھنے پر آمادہ کرنا واقعی

ایک کٹھن مرحلہ ہوتا - بارہ سال تک فقط قمیض کے زور پر حکمرانی کرنے والے اور شلوار کے جھنجھٹ سے آزاد زندگی گزارنے والے ان بچوں کو جب یونیفارم (شلوار قمیض دونوں) کا پابند بنا دیا جاتا تھا تو متعلم اور سکول میں مقرر واحد معلم دونوں کے پسینے چھوٹ جاتے تھے تاہم وہ حضرت مولا جٹ (ڈنڈے) کے سہارے حالات اور ماحول دونوں کو قابو کر لیتا تھا - آج تو خیر ہمارے بچے نہ اتنے بڑے رہے اور نہ شرارتی - پیدائش کے فوراً بعد شلوار پہنانے کے ساتھ ساتھ محض چار سال کی عمر تک پہنچتے ہی انہیں سکول کی راہ دکھائی جاتی ہے اور ہوم ورک کا اتنا بوجھ روزانہ ان کے کندھوں پر ڈالا جاتا ہے کہ وہ بے چارے شرارتیں ہی بھول جاتے ہیں - پھر بھی ان بچوں کی چھوٹی چھوٹی معصوم شرارتیں ضرور سامنے آتی ہیں - استاد یاری اسی قسم کا ایک قصہ یاد کر کے ایک بار بتانے لگے، ''ہمارے قریبی عزیزوں کا لڑکا جب زندگی میں پہلے پہل سکول جانے لگا تو واپسی میں آتے ہوئے اپنے بستے میں سکول سے سفید چاک کے اتنے ٹکڑے چرا کر لاتا کہ جن سے وہ قیمتی چمک دار فرنیچر کا ستیاناس کر دیتا - سکول کے تختہ سیاہ پر لکھی گئی تحریروں کے نقل قیمتی فرنیچر پر اتار کر وہ فرض شناسی اور اپنی طالب علمی کا سیدھا سادہ ثبوت پیش کر دیتا - دن بھر وہ فرنیچر کا حلیہ بگاڑتا رہتا جبکہ اس کی ماں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے اسے کوستی رہتی -

طالب علم اپنی اہمیت کے پیش نظر آج ہمارے ہاں ایک خاص مرتبہ و مقام رکھتا ہے - گھر میں ملنے والی شان و شوکت کے علاوہ حکومت بھی ان کے لئے بہت کچھ کر رہی ہے یا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے - ڈنڈے اور مار پیٹ کو پہلے ہی ممنوع قرار دے کر طالب علم کو ہر قسم کی سزا سے محفوظ بنا دیا گیا ہے - اپنی مرضی کا مضمون پڑھنے کی آزادی بھی اسے دے دی گئی ہے - والدین کو خبردار کیا گیا ہے کہ آپ اپنی مرضی اور پسند ناپسند ان پر مسلط نہ کریں اور نہ ہی ناکام ہونے پر اسے لعن طعن کریں - انہیں آزاد چھوڑ دیں اور بہترین خوراک انہیں مہیا کریں - پبلک ٹرانسپورٹ میں ان کا کرایہ پہلے ہی آدھا کیا جا چکا ہے - انہیں تحریر و تقریر اور جلسے جلوسوں کی آزادی بھی حاصل ہے - حکومت اور انتظامیہ کے خلاف یہ سڑکوں کو بھی بند کر سکتے ہیں - قوی امید ہے کہ ان اقدامات سے طلبا کے حقوق محفوظ رہیں گے اور وہ زیادہ محنت اور لگن سے اپنے کام کو جاری رکھیں گے

!!!-----

☆☆☆☆☆

پانچ پانی

بھیک کو ہم نے رزق جان لیا
رزق بانٹا کُھلے چھپے ہاتھوں
دل نے جاں پر نگاہ کیا رکھی
درد میں دل کھپا دیا ہم نے
اس خسارے کو نفع گردانا
اے مسافت تکان لاحق ہے
اے مسافت! تکان لاحق ہے
نطق پہ کُفر کا وبال لیے
چل دیئے ہم غضب کے رستے پر
آگ سی روشنی کے لپٹوں میں
زیرِ دستوں کا کون والی تھا
کوئی کس کو شریک ٹھہرائے
کوئی کس کو شریک ٹھہرائے؟
کِس کی آنکھیں ہیں کس کی آنکھوں میں
تنِ مَرمَر میں سُرخ ڈوروں کو
کون آنکھیں تلاش کرتی ہیں
اے زمین آسماں نہ نگل جائیں
ان طنابوں کو کون تھامے گا
ان طنابوں کو کون تھامے گا؟
کون صدیق تھا کتابوں میں
کس نے تصدیق کی کتابوں کی
آسماں ٹل چلے زمین والو
تہہ عالم تہیں دھڑکنے لگیں
لفظ کو دِل بنا دیا کس نے
لفظ کو دِل بنا دیا کس نے؟
چھاگلوں سے چھلک پڑا پانی
شاخچوں پر کھلی پھلوں کی دھنک
جنّتوں کی ہمیشگی کی قسم
نیکیوں کا کوئی ازالہ نہیں
درد بانٹو کُھلے چُھپے ہاتھوں

خالد احمد

کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِی شَانٍ ○

کیسے سیدھے سادے،
بھولے بھالے دن تھے
میں جب سارے پیار سمیٹے
''مُنّو'' کی دلبر ہستی سے
''بھیا'' کے منصب تک آیا
وقت نے پھر مجھ کو ''چاچو'' کے
شان بھرے استھان بٹھایا
اس سے آگے
جو شاہانہ سفر کرایا
سر پر ''ابّو جی'' ہونے کا
تاج سجایا
چلتے چلتے
دانش کا دھویا اُجلایا
کیا ہُشیار زمانہ آیا
دور دیس میں
آج اپنے کم سِن پوتے کو
میں نے خوشی سے فون ملایا
اور کہا
مرے پیارے بیٹے
تمہیں تمہارے بابا جان کی
سالگرہ ہو مبارک!

تو
ٹھک سے اس نے فرمایا
دادا!
آپ کو بھی اپنے بیٹے کی
سالگرہ ہو بہت مبارک!

جلیل عالی

حرف ریزے

شاداب چمن میرا
میں اس کا رکھوالا
یہ پاک وطن میرا

جو ملک بھکاری ہے
بازی بھی زمانے میں
اس ملک نے ہاری ہے

عزت ہے وڈیروں کی
مقروض ہے ہر بچہ
چاندی ہے لٹیروں کی

دہشت کی سیاست ہے
جاں رکھے ہتھیلی پر!
اس قوم کی حرمت ہے

دارا نہ سکندر کا
جاری ہے زمانے میں
فرمان سخنور ہے

بھادوں کا مہینہ ہے
مزدور کے مکھڑے پر
محنت کا پسینہ ہے

حسن عسکری کاظمی

گذشتہ آئندہ

۔۔۔اور اب ٹائم مشین ایسی انوکھی اور
نئی ایجاد کا
ہم نے یہی مصرف تلاشا ہے
کہ اس کے واسطے سے
ہم قیامت کو
بہت نزدیک لانے کی
تگ ودو میں لگے ہیں!

عہدِ سبز

نہایت خوش نما اور سبز رنگوں سے
بنی یہ پینٹنگ
اپنے ڈرائنگ روم میں ہم نے سجائی ہے
اور اس کے بعد
ہم نے دوسروں کو ہی نہیں
بلکہ خود اپنے آپ کو بھی
روز ہی اس خود فریبی کے سمندر میں
نہایت کامیابی سے اتارا ہے
کہ ہم نے اپنی زرخیزی سے مالا مال دھرتی پر
بڑا سرسبز اور شاداب اِک پودا اُگایا ہے!

نسیم سحر

اے مری عمرِ رواں.....

اے مری عمرِ رواں!
ایک لمحے کو ٹھہر
اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کوئی میرے لیے
اک دِیا اپنی ہتھیلی پہ لیے آتا ہے
اجنبی دیس سے آیا ہے ہوا کا جھونکا
موسمِ حبس میں یخ بستہ سندیسہ لے کر
آ، ذرا دیر کو اس پیڑ تلے دم لے لیں
جسم کا چھاؤں سے رشتہ ٹوٹے
مدّتیں بیت گئیں

دیکھ شاخوں پہ ہرے پات نکل آئے ہیں
ٹوٹتا جاتا ہے پت جھڑ کا فسوں
کِھلتے جاتے ہیں شگوفے، کلیاں
بھرتے جاتے ہیں چمن
پھیلتی جاتی ہے خوشبو ہر سو

بس اسی موڑ پہ اے جانِ انیس!
روک دے قافلۂ عمرِ رواں
چھوڑ دے پُشتِ فرس
کھول دے زِین و رکاب
مل رہا ہے گلے
تعبیر سے خواب

محمد انیس انصاری

میں.....؟

ہَوا خاموش ہے
برگ و ثمر سہمے ہوئے ہیں
پُھول تک چُپ ہیں
سرِ شاخِ تمنا، اَدھ کھلی کلیاں
ردائے خامشی اوڑھے پریشاں ہیں
پرندے اِک نئی ہجرت کے اَندیشے سے لرزاں
تتلیوں سے، جگنوؤں سے بات کرتے ہیں
مری سانسیں
بہاروں میں جو شاداب و معطر تھیں
کئی دن سے معطل ہیں
اِرادے کے ہنڈولے، آرزُو کے پالنے میں
اِک جہاں کو میری ہمراہی میں
دریا پار جانا تھا
مگر اب ایک مُدت سے
میں اپنی رَہبری میں خُود ہی چلتا ہوں
کہ میرا کارواں کنعاں کے رَستے میں گُم
راہِ محبت کے مسافر دنگ ہیں
اس عشق چُپ کی اوس میں بھیگا ہوا
اِک ادھ کھلا غُنچہ
سرِ دیوارِ گریہ دیر سے محوِ فغاں ہے
آئینوں میں نقش روشن ہیں
ہوا مُجھ سے گریزاں
ہجر کے اَندھے کنویں کی بُھربُھری
منڈیر پر بیٹھی تکے جاتی ہے مُدت سے
مری تنہائیوں میں ایک عالم کی سکونت ہے
یہ دل صحرا نہیں اک گُل کَدہ ہے
جس میں رشتوں اور وعدوں کے
رنگا رنگ پھُول کھلتے ہیں
میں ان پُھولوں سے باتیں کر کے
اَپنا دِل بڑھاتا ہوں

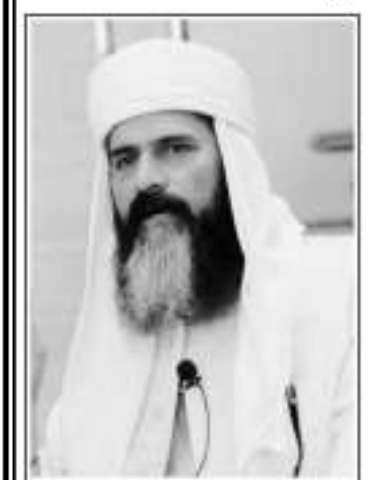

تابش کمال

میری ماں (عالمی یوم ماں کے حوالے سے)

جب میں بالکل چھوٹی سی تھی
سبز فراک پہنتی تھی میں
ماں کہتی تھی
بیٹی، تیری ساری زیست ہری ہی گذرے
بھرا بھرا سا سبزے والا
ایسا جیون جس پر کالی رات نہ اترے
ماں کو سبزے سے الفت تھی
سبز ربن سے میری چٹیا گوندھا کرتی
میری آنکھیں دیکھا کرتی، کہتی رہتی
ان آنکھوں کو چیل نہ کوئی دیکھنے پائے
کوئی وحشت بھی کھوج نہ پائے
میرا پیکر
ماں کو اچھا، بہت ہی اچھا، سب سے اچھا لگتا تھا
مجھے سنوارا کرتی تھی وہ
مٹھی مٹھی اپنے ہاتھوں مجھے نمایاں کرتی تھی وہ
ماں کی چاہت
ٹھنڈی ٹھنڈی مٹی جیسی
نہ کوئی شعلہ، نہ کوئی اگنی
بیحد کم گو ماں تھی میری
لیکن اس کا آنکھ اشارا

پلک ستارا
رب کا سایا
ماں تھی، کیا تھی
سمجھ نہ آیا.
سردرتوں میں ماں نے جتنی نرم دعائیں
میرے ماتھے کو بخشی تھیں
ان کا سورج جاگ اٹھا تھا
مجھ میں پتے پھوٹ پڑے تھے
شبنم ان پر رقص کناں تھی
اور شعور ذہانت بن کر
ہر تحریر میں آ بیٹھا تھا
ماں چاہتی تھی
میری بیٹی
زردرتوں سے میل نہ کھائے
سرخ چناری کھلتی جائے
لیکن پت جھڑ عریاں سچ ہے
اور ازل کی عریانی کو
کون ابد تک ڈھک پایا ہے؟
وقت ستم کے چھل بل لمحے
کون سکونت کر پایا ہے

فرخندہ شمیم

ماں مناظر کیسے دیکھے
قبر میں جا کر چھپ جاتی ہے
میری ماں بھی گور میں سو لی
اندھیاری راتوں نے میرے پیرہن کو کھینچنا چاہا
ماں نے قبر میں سسکی بھر لی
ناقدروں نے ہنر کو میرے بیچنا چاہا
ماں نے گور میں کروٹ بدلی
کچھ لوگوں نے ذہن کی شمعیں پھونکا چاہیں
ماں نے قبر میں ہاتھ بڑھائے
ماں کے اعضاء زندہ ہو گئے
اب تو ماں تھی اور بس میں تھی
ماں نے کالے ناگ بھی اپنی پھونک سے مارے
چیلیں بھی دامن سے جلا دیں
میرے رستے ستھرے کر کے
منزل بھی ریشم سی بنا دی

آج میرا پیکر اجلا ہے
اپنی ہستی، اپنی نظمیں
میں نے ماں کے ساتھ بچا لیں
حرف دعا جو ماں نے لکھا
آج مرے جینے کا رستہ

ہوس کے فینٹم

مفاد کی طشتری دلوں کے شکستہ منظر پہ تیرتی ہے
یہ جنگ زر کی، حصول منصب کی
دھیرے دھیرے بدن کی مٹی کو چاٹتی ہے
ہوس کے فینٹم وفا کے ٹینکوں سے لڑ رہے ہیں
زمینِ مہر و وفا کی سرحد کے پار توپیں
حسد کا بارود بھر رہی ہیں
یہ تجربہ اور تلاش کی جانکنی کا منظر
زمیں سے سیارگاہِ دل تک
غرض سے قبضہ جما لیا ہے
عطائے دستِ غنیم سے کب
سحر کی دل میں نمود ہوگی
ہوا خلاؤں میں تیرتی ہے
ہوا کی منزل جمود ہوگی

رخشندہ نوید

بے اختیار

مری ہتھیلی پہ
اُس نے
میری
ہی مدح کے
جب گلاب رکھے
میں خامشی سے
جھکائے سر کو
ذرا سی کانپی
پلک پلک میں
حجاب رکھے

معراجِ عشق

احمد جلیل

جب جدائی کا حوصلہ نہ رہے
جب من و تو میں فاصلہ نہ رہے

شوق منت کشِ بیاں نہ رہے
قاب قوسین درمیاں نہ رہے

جب کوئی اور امتحاں نہ رہے
جب محبت جنون ہو جائے

جب جگر خون خون ہو جائے
جب کبھی یہ فسون ہو جائے

اس کو معراجِ عشق کہتے ہیں
ہم اسی کیفیت میں رہتے ہیں

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

چہرہ تمام رنگ تھا، پیکر کرن تمام
کجلا کے رہ گئے مہ و پروین تن تمام

ANGISED

یہ گولی،
سینۂ بیمار میں جب
سینہ بھر کی پھانس رہ جائے
زباں کے نیچے نیچے
زِندہ رہنے کی اداکاری سکھاتی ہے
مرے حلقوم کی اِس تنگنائے سے گزرتی ہے
بہت ہی ریزہ ریزہ روپ کے بہروپ میں
جیسے اِسے معلوم ہو کس اَنت پر انجام ہونا ہے
کبھی تالو، کبھی تلوے گھماتے
آتے جاتے، شہر میں
معدوم کی کس کھوج میں سامان ڈھونا ہے
زباں کے نیچے نیچے آدمی آباد ہے،
یہ جانتی ہے
جبھی تو بول بھی پڑتی ہے:
آٹھوں پہر چٹخاروں پہ
کوئی روک ہونی چاہیے تھی
بے خطر جغرافیوں کی یم بہ یم اجناس پر،
بے وقت کا منہ مارنا،
تاریخ دسترخوان پر رکھی ملی تو کیوں لگا
سب ختم ہی کر کے اٹھو گے، سنتے ہو
اسطورہ، کوئی جانور جھٹکے کا تھا اور کھایا جاتا تھا
تمھارے گھر میں، نانے کے دنوں میں بھی
تمھیں ہڑتال پر بھیجا گیا اور تم نے
چٹخارے نہیں چھوڑے
اِدھر یہ گولی کیا کیا جانتی ہے میرے بارے میں
اُدھر لیکن مری تاریخ پیدائش نہیں ثابت،
حکومت کے کسی ریکارڈ سیل میں بھی
بدن ثابت نہ دِل ثابت
میں اپنے آپ میں جیسے
عدم آبادوں کا شوشہ
عدم موجودوں کی بولی
یہ گولی،
ہائے یہ گولی پہ گولی!!

شاہین عباس

مدینے میں سالگرہ

یوں تو ہر سال آتا ہے یہ دن مگر
آج تو اس کا کچھ اور ہی رنگ ہے
مجھ کو لگتا ہے جیسے زمیں پر نہیں
رفعتوں کے کہیں آسمانوں پہ ہوں
عمرِ کوتاہ کا اک نیا سال ہے
اور میں شہرِ طیبہ میں ہوں آج کل

مجھ کو محسوس یہ ہو رہا ہے یہاں
آج کے دن ہی جیسے ہوا ہے جنم

اس سے پہلے کی جو زندگانی تھی سب
رائیگانی تھی سب
جتنی سانسیں یہاں پر رواں ہو گئیں
جاوداں ہو گئیں

حاصلِ زندگی بس یہی سال ہے
جس کا آغاز شہرِ نبی میں ہوا

اک نئی زندگی کی شروعات ہے
جس میں بس نعت ہی نعت ہے

جس قدر بھی ہے میری متاعِ سخن
نعت کی نذر ہے
میری آواز کی دلکشی یا نبی
نعت کی نذر ہے
علم کی آگہی کی سبھی روشنی
نعت کی نذر ہے
حرف میں گفتگو میں ہے جو چاشنی
نعت کی نذر ہے

اس سے پہلے بھی سب آپ کا تھا مگر
زندگی آج سے
آپ کے نام ہے

سرور حسین نقشبندی

نظم

جہانِ دیگر

تو احتمالی تھا

وسوسوں سے دھواں دھواں تھا

تو خاکی منڈل بھی

نارسائی کی داستاں تھا

زماں گماں تھا

گماں مکاں تھا

دسوں دشاؤں کو بیچ سے کاٹتی

لکیریں بتا رہی تھیں

میں اپنے ہونے کا وہم تھا

ورنہ میں کہاں تھا

واحد سراج

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی ستم نیا نہیں ، کوئی کرم نیا نہیں
مرکزِ التفات بھی ، جاں ، ہدفِ خدنگ بھی

الوداعی پارٹی

لکھ رہا ہوں
محبت سے
اس کا نام
آٹوگراف بک پر

تعلیمی درس گاہ کی یونی فارم پہ
الوداعی جملے کی
میزبانی کرتے ہوئے
دست خط کر رہا ہوں
دعاؤں کے ساتھ

گروپ فوٹو
سیلفی کا رشتہ جوڑ رہا ہوں
مستقبل کے حسین ماضی سے

کسی فلم کے مناظر کی طرح
وقت، چہرے اور خواب
میرے ذہن میں گھوم رہے ہیں
نجانے کتنی معصوم
کومل، سجل باتیں
مجھے یاد آ رہی ہیں

میں ہر سال
سمندر میں
بہت سے موتیوں کو بکھیرتا ہوں
کتنے ہی خوابوں کو
تعبیر کے سفر پہ روانہ کرتا ہوں

میں ایک استاد ہوں
اپنے فرض اور منصب کی نگہبانی میں
نئے دن کے سورج کی کرنوں کا خیر مقدم کرتا ہوں

امجد بابر

نثری نظم

ہم دوسروں کو اکیلا کر کے کتنا خوش ہوتے ہیں
محبت کسی کی میراث نہیں
ساتھ چھوڑ جانے والے
خود بھی
اکیلے رہ جاتے ہیں
وہ لمحہ انکی زندگی سے نہیں نکلتا
وقت
پلٹ کر وار کرتا ہے
وقت کا وار بہت
کاری ہوتا ہے
ہم وقت سے نہیں ڈرتے
ہم دوسروں کے دکھوں پر تالی بجا کر ہنستے
ہیں یہ جانے بنا کہ
دکھ تو ہمارے گھر کے دروازے پر بھی
قدغن لگائے بیٹھے ہیں
جانے کب دہلیز پار کر آئیں
ہم وقت سے نہیں ڈرتے ہمیں
اپنی کج فہمی پر گھمنڈ ہے
ہم وقت کو نہیں سمجھ پاتے
وہ دھیرے دھیرے ہمارا پیچھا کرتا ہے
ہم آنسو پونچھنے والے ہاتھوں کو جھٹک دیتے ہیں
منافقت
ہماری رگوں میں خون کی طرح بہتی ہے
بہت محبت سے گلے لگانے والے ہی
پاؤں تلے سے زمین کھینچتے ہیں
پہچان میں نہیں آتا
سیڑھی سے دھکا دینے والا ہاتھ کس کا تھا
ہمارے کمفرٹ زون
میں
جو نہیں آتا
اسے روند کر گزرنا
دنیاداری کا پہلا زینہ ہے
اور یہ جانے بنا
کہ کب ہم بھی کسی کے کمفرٹ زون
سے نکالے جائیں
ہم آگے بڑھ جاتے ہیں
لیکن
وقت
پیچھا کرتا ہے
اور وقت کا وار بہت کاری ہوتا ہے

نائلہ راٹھور

''دیارِ غیر میں''

میں نے نئی منزلوں کے راستے خود ہی
تراشے تھے
اسباب کا انتظام اپنے سر لیا تھا
ہاں کچھ ضرورت کی اشیا تم سے مستعار
ضرور لی تھیں
میں جانتا تھا تم میرے ارادے سے قطعاً
ناخوش تھی
لیکن میں خودسر تھا جو دل میں آتا کر گزرنے
کی ٹھان لیتا
سود و زیاں کا کب میں نے سوچا تھا
تمہارے وجود کو خود سے الگ کرنا مشکل مرحلہ تھا
سو کر گزرا.....
ہاں کچھ دیر کے لیے تمہارا خیال آیا تھا
رخساروں پر ٹپکتے آنسو میں آج بھی نہیں بھولا
میں نے دل پر پتھر رکھ کر تمھیں کتنا ڈانٹا تھا
کہ دولت کی لکشمی بغیر ہجرت کیسے گھر آسکتی ہے
بھوکے پیٹ، ننگے جسم، بے رنگ در و
دیوار ہی تو غربت کا نام ہے
سو میں اسے ہی مٹانے چلا آیا.....
ننھی کے ہاتھ میں گڑیا نہ دیکھ کر دل تو میرا
بھی جلتا تھا
ہر روز یہی جھگڑا ہوتا کہ قلم کی روزی سے
محلات نہیں بنتے
سو.....تم دیکھو نا.....
میں نے قلم توڑ دیا.....
میرا قلم میرے کنبے کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا
تمہاری خوشیاں میرے لیے غم کا باعث
کبھی نہیں بنیں
اسی لیے اب میرے ہاتھوں میں قلم کی
بجائے کدال ہے
اور گھر میں خوشحالی ہے.....
تم اب مستعار لیے ہوئے سونے سے
کئی گنا زیادہ خرید سکتی ہو۔
دیارِ غیر سے.....

شبیر احمد آکاش

میری ٹیچر میری ماں ہے

[مادرز ڈے پر]

اعجاز رضوی

قلم گھڑنا،
قلم کی نوک روشنائی میں ڈپ کرنا،
ادھورے ملگجے کاغذ پہ اسم زندگی لکھنا،
محبت کو الگ لکھنا،
محبت جوڑ کر لکھنا، میرا پہلا سبق یہ تھا،
میری ٹیچر میری ماں ہے،
میرے بھائی، میری ماں کے محافظ ہیں،
وہ ہر دم ساتھ رہتے ہیں،
میں خدمت گار ہوں، جاروب کش ہوں، صحن مادر کا
میں جو لکھتا ہوں، کہتا ہوں، سمجھتا ہوں، وہ سب فیضان مادر ہے
مجھے ابا بھی اپنے یاد ہیں، لیکن کہیں یادوں میں رخنہ ہے
مگر امی، مجھے فرفر زبان یاد ہیں پوری، کی پوری!
انھیں کوششوں سے آج تک پورا گھرانہ یاد ہے مجھ کو
میرے سینے میں اب تک زندگی کی ابتدائی صبح زندہ ہے
میرے کانوں میں مغرب اور عشاء کا نور جاگا ہے
میرے کاندھے، ظہر کی اور عصر کی دھوپ ڈھوتے ہیں،
تھکن سے چور رہتے ہیں
مگر امی کا آوازہ، تھکن کو جھاڑ دیتا ہے
ارے بیٹا، یہ دنیا ہے، یہاں ناراض مت ہونا
سبھی سے پیار کرنا تم، کبھی بیزار مت ہونا
یہ ہی پہلا سبق بھی ہے یہ ہی ہے آخری لائن،
میری ٹیچر میری ماں ہے

مجھے ازبر ہے ہر پیرا،
مجھے ازبر ہے ہر لائن
میری ٹیچر میری ماں ہے

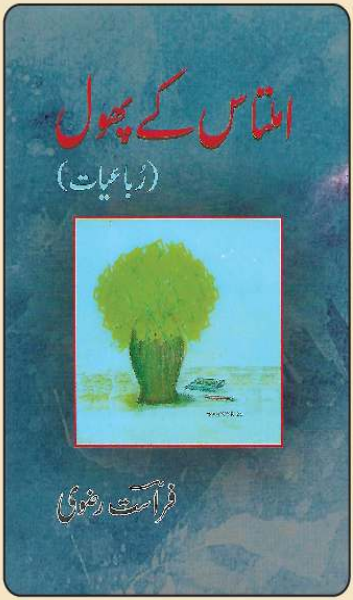

املتاس کے پھول
(رُباعیات)
فراست رضوی

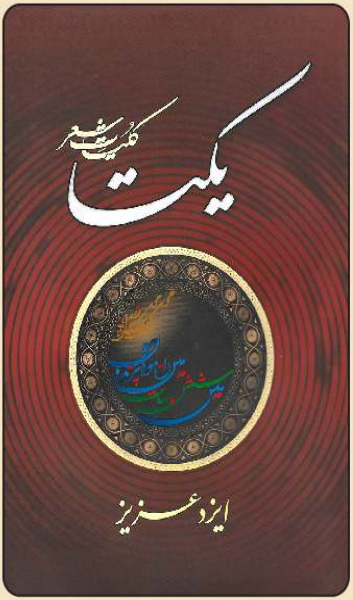

کلیاتِ شعر
یکت
ایزد عزیز

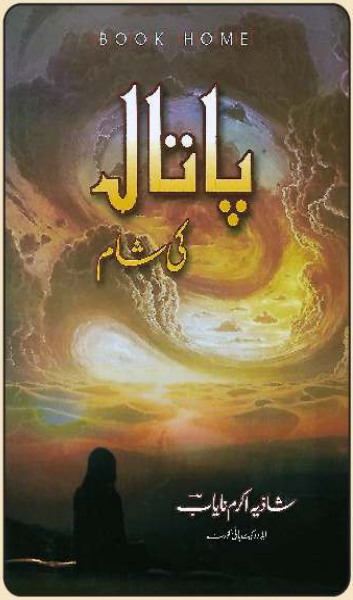

BOOK HOME
پاتال
کی شام
شافیہ اکرم نایاب

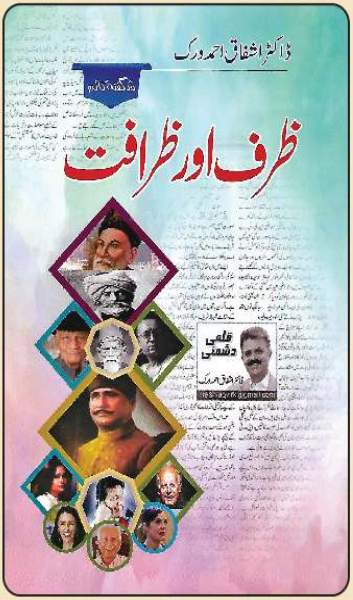

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک
ظرف اور ظرافت
قلمی دشمنی

جناب شہزاد احمد، جناب خالد احمد، جناب عقیل روبی

جناب حیات قاسمی، محترمہ ڈاکٹر ناہید قاسمی، جناب احمد ندیم قاسمی، محترمہ منصورہ احمد، محترمہ رعنا خالد
جناب خالد احمد، جناب حسین شاد، جناب جلیل عالی، جناب افتخار شوکت، جناب ایوب خاور

جناب عباس تابش کی دفتر بیاض آمد پر جناب عمران منظور،
جناب نعمان منظور اور جناب اعجاز رضوی سے ایک ادبی ملاقات